اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اگست ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۳ء/ شوال ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○فکر و نظر

پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل — مدیر — ۴

○ہمارا دینی تناظر

اختلاف رائے کی حدود و آداب اور ماہنامہ الشریعہ — ڈاکٹر محمد امین — ۵

دینی جماعتوں اور جماعت اسلامی کی خدمات — ۹

○تعلیم و تربیت

پاکستان میں پری سکول ایجوکیشن - ایک تنقیدی جائزہ — مرزا عزیز احمد — ۱۰

تعلیم اور بین الاقوامی سازش — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۷

○قرآنیات

قرآن اور سائنس — ڈاکٹر اشفاق احمد — ۲۰

○دعوت و تبلیغ

امکانیات الدعوۃ فی الالفیہ الثالثہ — الدکتور محمد امین — ۲۶

○اسلام اور مغرب

مغربی تہذیب خالص جاہلیت ہے؟ — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ — ۳۲

مغرب تہذیب سے ایمان کیسے بچایا جائے؟ — مولانا حذیفہ دستانوی — ۴۰

○اتحادِ امت

منشورِ وحدتِ اسلامی — علامہ سید جواد نقوی — ۴۸

ملی مجلسِ شرعی کے نام — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵۸

فکر و نظر

پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل

مئی ۲۰۱۳ء میں ہونے والے انتخابات میں دینی جماعتوں کی شکست نے ہم جیسے لوگوں کے لیے فکر مندی کا ایک در وا کر دیا ہے جو اس ملک اور معاشرے کا مستقبل اسلام سے وابستہ سمجھتے ہیں کیونکہ صرف دینی جماعتیں ناکام نہیں ہوئیں بلکہ جو سیاسی جماعتیں کامیاب ہوئی ہیں پاکستان کے اسلامی مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کوئی یقین دہانی نہیں کرائی بلکہ ان کا رویہ صریحاً سیکولرزم اور مغربی فکر وتہذیب کی حمایت کا ہے۔ چنانچہ نئی حکومت آنے کے باوجود میڈیا میں فحاشی اور عریانی بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ ملک کے نظام تعلیم و تربیت کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی آواز کسی حکومتی حلقے سے بلند نہیں ہوئی۔ ملک کی خود مختاری کو چیلنج کرتے ڈرون حملوں کے حوالے سے کوئی پیش رفت نظر نہیں آتی بلکہ امریکہ، یورپ اور بھارت کی تہذیبی اور ثقافتی یلغار اپنے عروج پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملک میں دینی مدارس کام کر رہے ہیں، مسجدیں آباد ہیں اور دینی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس سب کا حاصل کیا ہے؟ جب پاکستان بنا تھا اس وقت کے حالات کا آج کے حالات سے موازنہ کر لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ معاشرہ اسلام کے قریب آیا ہے اس سے دور ہوا ہے؟ لوگوں کی اخلاقی حالت پہلے سے بہتر ہوئی ہے یا بدتر ہوئی ہے؟ کرپشن، فراڈ، چوری، ڈاکے، زنا، جوئے، فحاشی، عریانی، ناچ گانے اور مادہ پرستی میں اضافہ ہوا ہے یا کمی ہوئی ہے؟ اسلامی قدروں کی پامالی بڑھ گئی ہے یا کم ہوئی ہے؟

ہم دینی مدارس، دینی تحریکوں اور دینی سیاسی جماعتوں سے کہتے ہیں کہ آیئے، مل بیٹھ کر سوچیے کہ پاکستان میں دینی کام کو موثر کیسے بنایا جائے؟ آپس کے اختلافات کو کیسے سمیٹا جائے؟ دین کے تحفظ اور غلبے کو یقینی کیسے بنایا جائے؟ اسلامی اصول و اقدار کو سکہ رائج الوقت کیسے بنایا جائے؟ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اور جس طرح کر رہے ہیں وہ اگر موثر نہیں رہا تو اسے مزید موثر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں؟ دعوت دین کی حکمت عملی میں کیا تبدیلی لائی جائے؟ سیاسی لائحہ عمل کو کیسے تبدیل کیا جائے کہ وہ موثر نتائج دے؟

اگر ان موضوعات پر ہم آج نہیں سوچیں گے تو کب سوچیں گے؟ کیا اس وقت جب پانی سر سے گزر جائے گا؟ اُس وقت سوچنے کا فائدہ؟ معارف کیجیے گا آکسیجن کی ضرورت زندہ کو ہوتی ہے مردوں کو نہیں؟ ہمیں آج آکسیجن کی ضرورت ہے جب ہمارا ایمان حالت نزع میں ہے اور ہمارے اعمال کی کھیتی

اجڑرہی ہے۔

ہمارا دینی تناظر ڈاکٹرمحمدامین

اختلاف رائے کی حدود و آداب
ماہنامہ'الشریعہ' کا موقف

ہمارے مخدوم مولانا زاہدالراشدی صاحب نے اختلافات کی حدوداورآداب پرقلم اٹھایاہےاور جہاد کے حوالے سے'الشریعہ'اور'ضرب مومن' کے اختلاف پرہمارے تبصرے کوبھی زیربحث لائے ہیں۔

۱۔ مولانا نے اپنے اداریے میں اختلافات کے جن چاردائروں کاذکرکیاہےہمیں ان سے اتفاق ہےاوراگران کی تجویزپرعمل کیاجائےتواختلافات کوکم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔البتہ پہلے دائرے میں یہودیت وعیسائیت کے ساتھ غیراسلامی تہذیبوں اورافکارکوبھی شامل سمجھنا چاہیے جیسے مغربی تہذیب یا کمیونزم وسیکولرزم وغیرہ۔

۲۔ ہم اپنے اس موقف پرقائم ہیں کہ اختلاف رائے کااظہارٹھنڈے دل ودماغ سے شائستہ، متین، مدلل اورسنجیدہ انداز میں کرنا چاہیےاورجذباتیت،طنز وتشنیع،غصےاوردشنام سے احترازکرنا چاہیے اوراختلاف رائے کوتنقیداورتنقیدکودشمنی وانتقام پرمحمول نہیں کرنا چاہیے۔

ہم اپنے اس رویے پہ بھی قائم ہیں کہ افراداوردینی مسالک وجماعتوں کواصولوں اورمشترکات پہ اکٹھاہونا چاہیے جوبہت ہیں اورجزوی وفروعی اختلافات کوبڑھاچڑھاکرپیش نہیں کرنا چاہیےاورامت میں انتشار،تشتت اورمسلک پرستی کی جوفضا قائم ہے اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیےاورتحمل و برداشت اوررواداری کوفروغ دینے کی جدوجہدکرنی چاہیے۔

۳۔ اس ضمن میں ہم نے عرض کیاتھاکہ مواقع اشتعال سے بچنا چاہیے یعنی اختلاف رائے کا اظہاراس طرح نہیں کرنا چاہیے کہ فریق ثانی مشتعل ہواوروہ دشنام اوربدگوئی پراترآئے۔ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب دوفریق آپس میں اختلاف کرتے ہیں،الجھتے ہیں تواگرایک دوسرے کوماں بہن کی گالی دےتومعاملہ بگڑجاتاہے۔دینی امورمیں بحث کابھی یہی حال ہے مثلاً ایک سنی اورشیعہ اگر مسئلہ امامت پربحث کررہے ہوں توامید ہے کہ بحث علمی دائرے میں رہے گی لیکن اگرشیعہ صاحب شیخینؓ کوگالی دیں توظاہرہے یہ اشتعال انگیزی ہوگی اورفریق ثانی کاردعمل بھی سخت ہوجائے گا۔

اس طرح کی اشتعال انگیزی پر کسی مسلمان کا برانگیختہ ہو جانا بعض اوقات اپنے اندر شرعی جواز بھی رکھتا ہے مثلاً ایک غیر مسلم اگر مسلمانوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے اور کوئی مسلمان اسے مشتعل ہو کر زخمی کر دے یا قتل کر دے تو شرعاً اسے سزا نہیں دی جا سکتی جیسا کہ ایک سے زیادہ مواقع پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ثابت ہے۔ اصول اور قاعدے قانون کی بات یہی ہے کہ اسے عدالت سے سزا دلوائی جائے لیکن اگر حالت اشتعال میں کوئی قدم اُٹھ جائے تو یہ ایک استثنائی معاملہ ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کفار کے خداؤں کو برا بھلا نہ کہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اونچا نہ بولیں تو اس کی ایک حکمت انہیں اشتعال سے بچانا بھی تھا کیونکہ اگر مسلمان کفار کے جھوٹے خداؤں کو برا بھلا کہیں گے تو جواب میں وہ مسلمانوں کے سچے خدا کو برا بھلا کہیں گے جو ان کے لیے باعث دکھ اور اشتعال ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی بدبخت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اونچا بولتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین صحابہ کو مشتعل کر سکنے کا باعث بن سکتی تھی۔

ہمارے مخاطب دراصل جاوید غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب تھے۔ جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگرد مسلسل ایسے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں جو جمہور علماء اور عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہیں اور ان کے نزدیک انحراف اور گمراہی پر مبنی ہیں بلکہ جامعہ اشرفیہ لاہور غامدی صاحب کے افکار پر کفر کا فتویٰ بھی دے چکی ہے۔ ہم نے اپنی متعدد تحریروں میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے غیر اسلامی افکار کا چولا اسلام پر فِٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے جتنے بھی اجتہادات اور تعبیر دین کی تاویلات سامنے آئی ہیں (مثلاً سنت کی ایسی تعریف جس سے احادیث کا استخفاف اور انکار ہوتا ہے۔ اجماع اور تعامل امت کا انکار، جہاد کی ایسی تاویلات جو اس کے انکار کے مترادف ہیں۔ قانون توہین رسالت کو مشتبہ بنانا اور توہین کی سزا کم کرنے کی خواہش و کوشش، زنا بالرضا کی شناعت کو کم کرنا، سزائے موت کا خاتمہ، مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق ہونا، موسیقی اور مجسمہ سازی جائز ہے، منکرین اسلام کو کافر نہیں کہا جا سکتا، داڑھی رکھنا دینی حکم نہیں، دوپٹہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، عورت کی دیت مرد کے برابر ہے، عورت نکاح پڑھا سکتی ہے، مسلمان لڑکی لڑکے کی دوستی جائز ہے، عورت نماز کی امام ہو سکتی ہے، مسلم عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح جائز ہے...... وغیرہ) وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مغربی فکر کے مطابق اسلام کی کتر بیونت کر رہے ہیں۔ حدیث و سنت کے بارے میں ان کا موقف تقریباً وہی ہے جو غلام احمد پرویز کا ہے اور جہاد کے بارے میں ان کا موقف تقریباً وہی

ہے جو غلام احمد قادیانی کا ہے اور ان دونوں کے کفر پر علماء متفق ہیں اور ان کے بارے میں علماء اور عوام جذباتی رویہ رکھتے ہیں۔

عبدالقادر الجزائری کے حوالے سے جو بحث عمار ناصر صاحب نے شروع کی ہے وہ بھی اسی قبیل کی ہے۔ اگست کے شمارے میں انہوں نے اس کی مزید وضاحت کی ہے۔ جہاد افغانستان کے حوالے سے وہ امریکی رویے کو حق بجانب اور طالبان کے رویے کو احمقانہ قرار دیتے ہیں، حکمران کے بغیر جہاد کو وہ جہاد نہیں سمجھتے، مطلب یہ کہ طالبان کو افغانستان میں امریکہ کے خلاف نہیں لڑنا چاہیے۔ عبدالقادر الجزائری سے ہمیں وہ یہ سبق سکھانا چاہتے ہیں کہ جب مسلمان امریکہ کے مقابلے میں کمزور ہیں ان سے جیت نہیں سکتے اور اتنا جانی و مالی نقصان اٹھا رہے ہیں تو الجزائری کی طرح جہاد ترک کر دینا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ موقف طالبان افغانستان کے لیے اشتعال انگیز ہے اور پاکستان کے علماء کرام کی ایک بہت بڑی اکثریت جہاد افغانستان اور طالبان کی حمایت کرتی ہے لہٰذا ہمارا عمار ناصر صاحب اور الشریعہ کو یہ مشورہ کہ اشتعال انگیزی سے پرہیز کرنا چاہیے، ان کی ہمدردی میں تھا۔ اس موقف کے حامی اور عمار ناصر صاحب کے دوست ڈاکٹر فاروق قتل کیے جا چکے ہیں، خود جاوید صاحب اور ان کے بعض ساتھی جان کے ڈر سے ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں لہٰذا عمار ناصر صاحب کو ایسی بحثیں نہیں چھیڑنی چاہئیں جو اشتعال کا باعث ہوں۔

کثرت اختلاف کا اشارہ بھی عمار ناصر صاحب اور جاوید غامدی صاحب کی طرف تھا۔ شاذ اور انفرادی آراء ہمیں تقریباً ہر بڑے عالم کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لوگ ان کی اکثر آراء کو جو جمہور کے مطابق ہوتی ہیں، اہمیت دیتے ہیں اور شاذ آراء سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں یا کوئی ان سے موافقت یا عدم موافقت کا اظہار کر دیتا ہے لیکن غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب نے گویا قسم کھا رکھی ہے کہ کسی معاملے میں جمہور علماء سے اتفاق نہیں کرنا۔ وہ احادیث کو رد کرتے ہیں، محدثین کے خلاف بولتے ہیں، فقہاء میں سے نہ انہیں احناف کی پروا ہے نہ ائمہ اربعہ کی بلکہ وہ اجماع ہی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ محقق صوفیاء کی آراء کو وہ متوازی دین قرار دیتے ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ یہ رویہ مناسب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک عافیت ''جمہور کے اسلام'' اور اسلاف کے دینی مسلمات کے ساتھ جڑے رہنے میں ہے نہ کہ ہر معاملے میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں۔

عمار ناصر صاحب اور غامدی صاحب کے مغرب پرستانہ اور مغرب سے مرعوبانہ فکری رویے کو ہم اس لیے غلط اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں کہ امت اس وقت زوال سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے لہٰذا ہماری

ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے دین سے، اپنی اقدار سے اور اپنی روایات سے جڑیں نہ کہ استعماری فرنگیوں کے نظریات سے مرعوب ہو کر ان کی اقدار کو اپنائیں اور ان کی خواہشات کو پورا کریں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ انہیں امت مسلمہ پر ظلم کرنے کی کھلی چھٹی ملی رہے اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔ مسلمان ان کی معاشرت و معیشت کو اور ان کی تہذیب و ثقافت کو اپنالیں سیاسی طور پر ان سے مغلوب اور حربی طور پر ان سے کمزور رہیں اور ان کے غلام بنے رہیں۔ جاوید غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کا رویہ استعمار کی معاونت کا ہے لہٰذا جمہور علماء اور مسلمان جو اسلام کو اپنی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں اور مغربی استعمار کی اسلام اور مسلم دشمنی میں اس کی مزاحمت کرنا چاہتے ہیں، وہ غامدی صاحب کے رویے کو ناپسند کرتے ہیں۔ مغربی فکر و تہذیب کے خلاف اسلام ہونے اور اہل مغرب کا اسلام اور مسلم دشمن ہونا ظاہر و باہر ہے (اور خود مولانا زاہد الراشدی صاحب نے اپنے اسی اداریے کے مصر سے متعلق شذرے میں اسے تسلیم کیا ہے) اور پاکستان کے علماء اور عوام کی امریکہ و یورپ کے استعماری رویے کی ناپسندیدگی کا اظہار پاکستانی اور امریکی تھنک ٹینکوں کے سروے سے کئی بار ہو چکا ہے، لہٰذا یہ امر بھی ثابت شدہ ہے۔

کافر

میں نے ایک پُل پر ایک آدمی کو دیکھا جو خودکشی کے لیے چھلانگ لگانے والا تھا۔ میں نے اسے کہا: ٹھہرو، ایسا نہ کرو۔ اس نے کہا: کسی کو میری پروانہیں۔ میں نے کہا: اللہ کو تو ہے۔ ویسے، کیا تم اللہ کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: کیا تم مسلم ہو یا غیر مسلم؟ اس نے کہا: مسلم۔ میں نے کہا: الحمدللہ! میں بھی مسلمان ہوں۔ شیعہ ہو یا سنّی؟ اس نے کہا: سنّی۔ میں نے کہا: الحمدللہ میں بھی سنّی ہوں۔ تمہارا مسلک کیا ہے؟ اس نے کہا: حنفی۔ میں نے کہا: الحمدللہ! میں بھی حنفی ہوں۔ دیوبندی ہو کہ بریلوی؟ اس نے کہا: بریلوی۔ میں نے کہا: الحمدللہ! میں بھی بریلوی ہوں۔ تنزیہی ہو یا تکفیری؟ اس نے کہا: تنزیہی۔ میں نے کہا: میں بھی تنزیہی ہوں۔ تنزیہی عظمتی ہو یا تنزیہی فرحتی؟ اس نے کہا: تنزیہی فرحتی۔ میں نے کہا: الحمدللہ، میں بھی تنزیہی فرحتی ہوں۔ تنزیہی فرحتی جامعۃ العلوم اجمیر یا جامعۃ النور میوات؟ اس نے کہا: تنزیہی فرحتی جامعۃ النور اجمیر۔ میں نے کہا: لیکن میرا تعلق تو تنزیہی فرحتی جامعۃ النور میوات سے ہے...... لگاؤ چھلانگ اور جہنم میں جاؤ۔ کافر نہ ہو تو! اور میں نے

اسے دھکا دے دیا۔

(پروفیسر شاہد رشید، لاہور)

ہمارا دینی تناظر　　　مدیر

دینی جماعتوں اور جماعت اسلامی کی خدمات کا اعتراف

مئی ۲۰۱۳ء میں ہونے والے انتخابات میں دینی جماعتوں کی ناکامی سے اس ملک کے اسلامی مستقبل کے حوالے سے خواب دیکھنے والوں کی توقعات کو سخت ٹھیس پہنچی اور بہت سے محب اسلام دانشوروں نے دینی جماعتوں کی کارکردگی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں اور خامیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور انہیں بہت سی کارآمد اور مفید تجاویز مستقبل کے حوالے سے پیش کیں۔

اس حوالے سے البرہان میں بھی بعض اہل دانش کی ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن کا لب ولہجہ قدرے سخت تھا۔ اگرچہ ہماری سوچی سمجھی اور اعلان کردہ پالیسی البرہان کے آغاز ہی سے یہ ہے کہ ہم علماء کرام اور دینی جماعتوں کے خادم ہیں۔ ہمیں اگر کبھی ان سے اختلاف بھی ہوگا تو ہم اپنی معروضات سلیقے اور ادب سے پیش کریں گے اور ان سے اپنے موقف پر نظر ثانی کی درخواست کریں گے کیونکہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ دینی مدارس اور دینی جماعتوں کا کام پہلے سے زیادہ موثر ہو جائے اور وہ زیادہ بہتر، مفید اور موثر انداز میں ایسی حکمت عملی بروئے کار لائیں جس سے پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست کی زندگی میں اسلام آ جائے۔ اس سلسلے میں دینی قوتوں کے مفید اور تعمیری کاموں کی تائید کی جانی چاہیے اور اگر ان کے کام میں کوئی خامی ہو تو خلوص اور دردمندی سے نرم الفاظ میں اور اچھے انداز میں ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے۔ ہم علماء اور دینی جماعتوں پر ایسی تنقید کی حمایت نہیں کرتے جس سے ان کی ہوا خیزی ہو اور ان کی نیک نامی پر حرف آئے...... کیونکہ ہمارے پیش نظر اصلاح ہے اور اصلاح ہمیشہ خوش دلی اور اندر کی طلب سے ہوتی ہے نہ کہ طنز و تشنیع اور دل آزاری سے۔

دوسری دینی قوتوں کے ساتھ ہمارے دل میں جماعت اسلامی کی بھی بہت قدر و منزلت ہے کیونکہ جماعت نے فرقہ واریت سے بالاتر رہتے ہوئے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستانی ریاست وسیاست کو اسلام کے مطابق چلانے میں جن دینی قوتوں نے مسلسل اور کامیاب محنت کی ہے ان میں جماعت کا حصہ وافر ہے۔ پھر انتخابات میں کامیاب یا ناکام ہونا کل دین نہیں بلکہ دین کی صرف ایک جہت ہے اور دینی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی نے خدمت خلق، اشاعت لٹریچر، آئین وقوانین کی اسلامی تشکیل، نظام تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح کے میدانوں میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے اور اس سب کی تائید اور تحسین کی جانی چاہیے۔

انسانی کام میں کمی کوتاہی ہوسکتی ہے اور آدمی ہمیشہ اپنی ناکامیوں سے سیکھتا ہے۔اس لیے دینی جماعتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی ناکامی پر غور کریں، اس کے اسباب وعلل کا جائزہ لیں اور مستقبل کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کریں جس سے موثر نتائج نکل سکیں اور ان کی جدوجہد نتیجہ خیز ہوسکے۔

تعلیم و تربیت　　　مرزا عزیز احمد

پاکستان میں پری سکول ایجوکیشن

اسلامی تناظر میں ایک تنقیدی جائزہ

تعلیم کے مختلف مراحل ہیں اور ایک عمارت کی طرح پہلا مرحلہ بنیاد کا کام دیتا ہے۔اس کے اوپر دوسرا اور پھر تیسرا تعمیر ہوتا ہے۔

ا۔غیر رسمی مرحلہ:مکتبِ مادر

تعلیم کا پہلا مرحلہ گھر اور کنبہ میں شروع ہوتا ہے۔اس مرحلہ پر تعلیم غیر رسمی ہوتی ہے اور زندگی کے پہلے دن سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی جلد موسم کے مطابق گرمی یا سردی محسوس کرتی ہے۔اس کے کانوں میں کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔غسل کرنا اور کپڑے پہننا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے اور ہر تجربہ اس کے لیے سبق آموز ہوتا ہے۔مسلمان بچہ پیدائش کے ساتھ ہی نہا دھو کر کپڑے پہن کر اذان اور اقامت کی آواز سنتا ہے۔الفاظ اللہ، الٰہ، محمد رسول اللہ، صلوٰۃ، فلاح سنتا ہے...... کیسے مبارک نام اور کیسا مبارک تجربہ!

گھر کے ماحول میں بچہ کروٹ بدلنے، بیٹھنے، کھڑا ہونے، چلنے اور پھرنے جیسی مہارتیں سیکھتا ہے۔نطق جیسی بے بہا صلاحیت پر قدرت حاصل کرتا اور زمان ومکان کے ابتدائی تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ پھر ہر کنبے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ بچہ اس ثقافت کے ابتدائی عناصر بھی اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے۔ گھر ہمہ وقتی مدرسہ ہے۔ کنبے کے افراد بے دام معلم ہوتے ہیں اور خود بچہ آپ اپنا معلم ہوتا ہے۔

ان سب وجوہات کی بنا پر راقم یہ رائے رکھتا ہے کہ گھر کا مدرسہ بہت ہی موثر مدرسہ ہے کہ بچہ اس مدرسہ میں نطق اور مشاہدہ کی جو صلاحیتیں اور مہارتیں حاصل کرتا ہے اور زمان دمکان کے جو تصورات اس کے ذہن میں تشکیل پاتے ہیں ان کی فراہم کردہ بنیاد پر ہی آئندہ ہر طرح کی آموزش اور اکتساب علوم

وقوع پذیر ہوں گے۔

غیر رسمی تعلیم کے مرحلہ کا آغاز تو زندگی کی پہلی سانس سے ہی ہو جاتا ہے لیکن یہ مرحلہ کنڈر گارٹن سے یونیورسٹی تک رسمی تعلیم کے دوران بھی جاری رہتا ہے بلکہ منتہی جامع تعلیم کے بعد زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے۔ اسی لیے تو معلم انسانیت ﷺ نے مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین فرمائی چونکہ آئندہ تحصیل علم کی بنیاد گھر پر سیکھی گئی مہارتوں نے فراہم کرنی ہے اس لیے گھر کے مدرسہ کو مزید موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

ہمارے نزدیک گھر کے اس غیر رسمی اور بے ساختہ (Spontanesous) مدرسہ کے نصاب اور ہم نصابی سرگرمیوں کے تانے بانے (Fabric) میں مرکزی مقام ان ہدایات کو حاصل ہونا چاہیے جو احادیث نبوی میں دی گئی ہیں۔

ان کے بعد انسان نے صدیوں کے اپنے تجربہ، مشاہدہ اور تفکر سے ابتدائی بچپن میں بچے کی صحت مندانہ دیکھ بھال، اس کی فطرت، آموزش اور تربیت کے متعلق فکری اور عملی اقدامات مرتب کیے ہیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ یہ راہنمائی مسلم اکابرین سے بھی حاصل کرنی چاہیے اور غیر مسلم سوشل سائنسدانوں سے بھی۔ مناسب ہوگا کہ کوئی صاحب نظر اس موضوع پر ایک جامع مقالہ لکھیں۔

۲۔ ابتدائی بچپن کی تعلیم (Early Childhood Education)

مغرب میں اس کا ارتقاء اور ہماری کورانہ تقلید

ا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں صنعتی کارخانے قائم ہوئے تو ان کے قریب مزدوروں کے کوارٹر بھی تعمیر ہوئے۔ بہت سے جوڑے مزدوری کرنے دیہات اور مضافات سے نقل مکانی کر کے ان بستیوں میں رہائش پذیر ہو گئے۔ باپ بھی کارخانے میں کام کرنے لگا اور ماں بھی۔ گھر پر بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ صنعت و تجارت کے فروغ سے یورپ کے شہروں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور نئی منڈیوں اور خام مال کے حصول کے لیے سامراجی عزائم نے فروغ پایا۔ ممالک فتح کرنے کی دوڑ میں افواج کی بھرتی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ مرد افواج میں چلے گئے اور عورتوں کی بڑی تعداد کارخانوں میں مزدوری کرنے لگی۔ معاشرتی مسئلہ سامنے آیا کہ ننھے بچوں کو کون سنبھالے؟ بعض خواتین نے کار خیر کے طور پر پلے گروپ اور ایک کلاس روم کے نرسری سکول قائم کر لیے۔

ب۔ شہروں میں آبادی کے اضافہ کے نتیجہ میں چھوٹی مکانیت کے مکان اور کثیر منزلہ فلیٹ بن

گئے۔ گھروں میں صحن غائب یا چھوٹے ہو گئے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے کھلی جگہیں نابود ہونے لگیں۔ پھر ہر کوئی بچوں کے لیے عمدہ اور مہنگے کھلونے اور کھیلنے کا سامان نہیں خرید سکتا تھا۔ ادارے اور تنظیمیں اشتراک عمل سے بڑی رقمیں خرچ کر کے کھیلنے کا عمدہ سامان خرید سکتے تھے اور کھیلنے کے لیے درکار جگہ بھی مہیا کر سکتے تھے چنانچہ اس سوچ کو قبول عام حاصل ہوا۔ پچھلی چار صدیوں میں یورپ اور پچھلی ایک صدی میں امریکہ میں بھی ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے ابتدائی بچپن کی تعلیم، بچوں کی نفسیات، آموزش کی ماہیت، حواس کی تربیت، تعلیم میں مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت پر قابل قدر تحقیقی کام کیا۔ ان کے نظریات کے ابلاغ کے نتیجہ میں اب یورپ، امریکہ اور بعض دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نرسری، کنڈر گارٹن اور مونٹیسوری ایجوکیشن نے قبل از پرائمری تعلیم کو ایک اہم مرحلہ تعلیم کی حیثیت سے منوالیا ہے۔

اس گفتگو سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغرب میں ابتدائی بچپن کی تعلیم (Early Childhood Education) کا ارتقاء معاشرتی ضرورت کے تحت فطری طریقے سے ہوا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں اس مرحلہ کو فروغ امیر گھرانوں کے چونچلوں اور اظہار علو مرتبت (Status Symbol) کے طور پر ہو رہا ہے۔ ہمارا نظام تعلیم چونکہ دور غلامی میں انگریزوں کے نافذ کردہ نظام تعلیم ہی کا تسلسل ہے اس لیے ہمارے ابتدائی بچپن کے تعلیمی ادارے بھی کنڈر گارٹن اور مونٹیسوری (Montessori) مدارس کی برطانوی (Adaptation) کا چربہ ہیں۔ ہمارے ہاں علوم میں تحقیق کا عنصر برائے نام ہی پایا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی نفسیات، تعلیمی نفسیات، عمل تعلم جیسے موضوعات پر تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے میں نرسری تعلیم کی اٹھان اپنی خاک سے اپنی روایات، اپنی ملی آرزوؤں اور ضروریات کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے فوری طور پر ممکن ہی نہ تھی کہ ملک کے اندر اس کی نہ کوئی بنیاد ہے نہ نظر اور نہ روایت۔ چنانچہ اس کی بنیادی فکر بلکہ اس کا پروگرام بلکہ اس کا پورا نظام مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔

انگلستان میں نرسری سکولوں کے عمومی مقاصد میں سے ایک مقصد زبان کی نمو ہے، دوسرا مقصد آداب سکھانا اور تیسرا مقصد ایسا خوشگوار ماحول فراہم کرنا ہے جس میں بچے کھیل کود اور مختلف مشاغل میں مصروف ہو کر ان سے حظ اٹھائیں، ان کے حواس کی تربیت ہو۔ جسمانی نمو ہو اور عضلات میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ وہاں بچوں کو ان کی مادری زبان سکھائی جاتی ہے۔ اس زبان کے ذریعہ انگریزی کلچر خود بخود ایک فطری طریقے سے بچوں کو منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً ان کے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سے اسماء (گھر کے ساز و سامان، کھلونوں، آلات موسیقی، کھانے پینے کی اشیاء، لباس، جانوروں اور رنگوں کے نام) بہت سے افعال (اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سونے، کھیلنے، لکھنے، پڑھنے وغیرہ اور چند ایک دیگر کلمات گفتگو کرنے اور گفتگو سننے کے فطری طریقے سے ان کی زبان کا جزو بن جاتے ہیں۔

لسانیت (زبان دانی) کی مزید استواری کے لیے بچوں کو تصاویر دکھائی جاتی ہیں اور ان کے متعلق ان سے گفتگو کی جاتی ہے، سوال پوچھے جاتے ہیں اور تصاویر میں جو کچھ دکھایا گیا ہوتا ہے وہ بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہ تصاویر ان کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ کسی میں دادی اماں کتے کی ڈوری پکڑے پارک میں ٹہل رہی ہیں۔ کہیں کتا انگیٹھی کے قریب بیٹھا چھوڑے بچے کا منہ چاٹ رہا ہوتا ہے۔ ساحل سمندر کی تصویر میں عورتیں مرد، بچے بچیاں مخصوص چڈیاں پہنے عریانی کو شرماتے دکھائے گئے ہوتے ہیں۔ کوئی تصویر چرچ کو جاتے کنبے کو دکھاتی ہے تو کوئی شجر کرسمس۔ تصاویر میں موسیقی کے آلات اور رقص بھی دکھائے جاسکتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ صرف یہ تصاویر دکھائی جاتی ہیں۔ بہت سی دیگر تصاویر، کھیل کے سامان۔ قدرتی مناظر اور جانوروں اور بچوں کی بھی ہوتی ہیں جو نرسری کے بچوں کو گفتگو پر راغب کرتی ہیں اور انہیں بہت مفید معلومات فراہم کرتی ہیں لیکن ان سب تصاویر میں مغربی کلچر کا بھرپور انعکاس ہوتا ہے۔

زبان سکھانے میں اہم کردار کہانیاں سنانے اور نرسری رائم یاد کرانے کا بھی ہے۔ نرسری سکولوں کے نصاب میں کارٹون فلموں کو پچھلے چند برسوں میں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ Pink Panther Mickey Mouse' Donald Duck اور Doraemon تو ٹی وی فلموں کے واسطے سے دنیا بھر کے بچوں کے اذہان پر چھا چکے ہیں۔ ان کی فلمیں وڈیو کیسٹ اور اب C.Ds پر منتقل ہو کر نرسری سکولوں ہی میں نہیں بلکہ بہت سے گھروں میں پہنچ چکی ہیں۔

ظاہر ہے ہر قوم کو اپنی روایات اور کلچر سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ نرسری سکولوں میں سنائی جانے والی کہانیاں، یاد کرائے جانے والے نرسری رائمز اور دکھائی جانے والی کارٹون فلمیں انگریزی بچوں کو ان کا لوک ورثہ بڑی کامیابی سے منتقل کرتی ہیں اور انگریزی تہذیب اور تمدن کو ان کی مدرسی زندگی کے آغاز سے بھی پہلے ان کی شخصیتوں کے پیکر میں داخل کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ یاد رہے کہ انگریز بچے اپنے فطری ماحول میں اپنی مادری زبان فطری طریقے سے بے ساختگی سے سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا پورا ماحول گھر، سیرگاہیں، دکانیں، بازار اور ٹیلی ویژن اس زبان کے سیکھنے میں ان کی معاونت کرتے ہیں۔ جہاں تک آداب سکھانے میں نرسری سکولوں کے کردار کا تعلق ہے، وہ سب پر عیاں ہے۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ کردار کے بیج بچپن میں بوئے جاتے ہیں، نرسری سکول بچوں کو تسلیمات وآداب خوش آمدید کہنے الوداع ہونے اور الوداع کہنے کے کلمات کا بے ساختہ استعمال، کھانے پینے، نشست و برخواست اور گفتگو کے آداب سکھاتے ہیں اور قوت مشاہدہ کی تربیت غیر محسوس طور پر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پابندیٔ وقت، اپنی باری کا انتظار، دوسروں کا پاس لحاظ، کھیلنے اور کام کرنے میں ایک دوسرے سے معاونت اور

شائستگی کی تربیت دیتے ہیں...... یہ مغربی طرز زندگی کے قابل تعریف اور قابل قدر پہلو ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں نرسری سکولوں میں بچے انسانی فطرت اور تعلیمی نفسیات کے مسلمہ اصولوں کے برعکس ایک غیر ملکی زبان کو (جسے سیکھنے کا آغاز ثانوی زبان کی حیثیت سے گیارہ بارہ برس کی عمر میں کرنا چاہیے) زندگی کے تیسرے سال ہی سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بہت سے اسماء کے مسمّٰے وہ اپنے ماحول میں کہیں نہیں دیکھتے۔ انگلستان میں نرسری سکول کی عمر کے بچے جن اسماء کے محسوس پیکر اپنے ماحول میں دیکھتے، چھوتے اور محسوس کرتے ہیں ہمارے ہاں کے بچے انہیں مجرد الفاظ کے طور پر سنتے (اور بعض صورتوں میں پڑھتے) ہیں۔ پھر جو کہانیاں وہ سنتے ہیں، جو نرسری رائمز وہ یاد کرتے ہیں، جو کارٹون فلمیں وہ دیکھتے ہیں ان سب کا تہذیبی پس منظر ان کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ اس اجنبی تہذیبی پس منظر کا کوئی کسری حصہ بھی اگر ان کے فہم وادراک کا جزو بن جائے تو بسا اوقات وہ ان کی اپنی تہذیبی اقدار سے متصادم ہوتا ہے۔

ایک اور پہلو انگریزی کی تدریس کا یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے ابتدائی بچپن کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے ننھے منے بچوں کی صرف مدرسہ کی زبان ہے۔ مدرسے سے باہر اس کے سیکھنے میں انہیں کوئی معاونت نہیں ملتی۔ اگر ایک فی دس ہزار گھرانوں میں انگریزی بولی بھی جاتی ہو تو یہ غیر فطری حرکت گنتی کے چند بچوں ہی کی معاونت کر سکتی ہے۔ یہی حال ٹیلی ویژن پروگراموں کا ہے۔ کارٹونوں کے علاوہ شاید ہی کوئی پروگرام ہو جو ان کی معاونت کرتا ہو۔ دوسری جانب اپنی مادری یا قومی زبان سیکھنے کی صورت میں بچوں کو اس واسطے سے اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی لوک روایات سے آشنائی کے جو مواقع حاصل ہو سکتے تھے وہ انگریزی زبان پڑھنے کی وجہ سے ان سے محروم رہتے ہیں۔

آداب سکھانے کے معاملہ میں تو ہمارے نرسری سکولوں کے منتظمین نے ذہنی غلامی کی حد کر دی ہے۔ محض دھونس جمانے کی خاطر تسلیمات کے باب میں السلام علیکم، وعلیکم السلام کہنا سکھانے کی بجائے Good night' Good evening' Good morning سکھایا جاتا ہے۔ کھانے پینے اور نشست و برخواست کے مغربی آداب سکھائے جاتے ہیں۔ بچوں کا لباس تک مغربی طرز کا ہوتا ہے۔ خود انگلستان اور یورپ کے نرسری سکولوں میں بچوں کے لیے یونیفارم کی پابندی پر وہ زور نہیں جو ہمارے نرسری سکولوں میں ہے۔ وہاں بہت سے ماہرین، منتظمین اور اساتذہ اسے بچوں پر ناروا پابندی اور (Regimentation) پر محمول کرتے ہیں۔ پھر ان کے نزدیک رنگا رنگ اور قسم ہا قسم کے متنوع لباسوں میں ملبوس ہونا کلاس روم کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ ہمارے اکثر نرسری سکولوں اور انگلش میڈیم

ابتدائی اور ثانوی مدارس میں بدذوقی کی حد تک چھوٹے بچوں پر گردنوں میں نکٹائیاں اور کمروں پر پیٹیاں باندھنا لازم ہے۔

مدرسے کا پورا ماحول بھی مغربی کلچر کی عکاسی کرتا ہے۔ صحن اور کمروں کی دیواروں پر Donald Duck اور Mickey Mouse کے قد آدم سٹیکرز یا Plastic casts آویزاں ہوتے ہیں۔ بچے اپنے اپنے برتھ ڈے پر گھر سے مٹھائی لے کر آتے ہیں جو سکول میں تقسیم ہوتی ہے اور Happy Birthday to you گایا جاتا ہے۔

جب یہ ثابت ہے کہ آموزش کا عمل پیدائش کے فوراً بعد کے لمحات سے شروع ہو جاتا ہے تو یہ بحث بے معنی ہو جاتی ہے کہ ابتدائی بچپن کی تعلیم کا نیا مرحلہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ پھر قرین عقل تو یہی ہے کہ گھر پر بھی شیر خوار بچے کی آموزش کو حکمت سے مزید موثر بنایا جائے اور پرائمری سکول کی رسمی تعلیم کے آغاز سے پہلے گھر اور مدرسے کے درمیان ایک نئے مرحلے میں نیم رسمی (کھیل اور تدریس کا ملا جلا پروگرام) تعلیم کا ادارہ منظم کیا جائے جہاں بچہ ایک خوش گوار ماحول میں کھیل کھیل میں ایسی مہارتیں سیکھ لے جو اُسے پرائمری سکول کی رسمی تعلیم کے لیے جسمانی اور ذہنی آمادگی عطا کریں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مرحلہ کے پروگرام کو مسلمان پاکستانی بچوں کی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جائے جس کے لیے ناگزیر ہے کہ:

☆ مدرسہ کی زبان اردو ہو۔

☆ آداب یورپی کی بجائے اسلامی سکھائے جائیں۔

☆ پروگرام اور معاونات میں بیرونی کلچر کی بجائے مسلم ثقافت کا انعکاس ہو۔

بصورتِ دیگر جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں نرسری، کنڈرگارٹن اور مونٹیسری سکول کے پروگرام کی جھلک دکھائی ہے ہمارے معصوم بچوں کو زندگی کے ابتدائی برسوں میں ہی مغربی کلچر کی بپتسمہ دے دی جاتی ہے جو دل لبھانے والی بھی ہوتی ہے اور موثر بھی۔ اور اہم بات یہ ہے کہ جن گھرانوں کے بچے ان مہنگے سکولوں میں جاتے ہیں اُن گھرانوں کے افراد ہمارے معاشرے کی کسی نہ کسی سطح پر فیصلہ سازی میں شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی بچپن کی اس تعلیم کی فراہم کردہ بنیاد پر انگلش میڈیم کی پرائمری، ثانوی اور بعد کے مراحل کی تعلیم ہماری ہیئت حاکمہ کو مغربی تہذیب سے مرعوب اور اسلامی تہذیب سے نابلد ایسے افراد مہیا کرتی ہے جن کی نااہلی اور بے تدبیری ہمارے ملک کی اکثریت کی فلاکت زدگی، معیاری تعلیم سے

محرومی، حقوق وفرائض سے ناآشنائی، طبقاتی استحصال اورقوموں کی برادری میں ہماری بے وقعتی کی ذمہ دارہے۔

اس مرحلہ تعلیم پر بھی ایک جامع کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

ایک تجویز: جس طرح ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر ماں بھی فطرتاً مسلمان پیدا ہونے کے علاوہ فطرتاً معلمہ بھی ہوتی ہے۔ وہ اَن پڑھ بھی ہوتو بالقوۃ (Potentially) تو اُسے سمع، بصر اور فواد کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہوتی ہیں۔ کمی یہ ہے کہ رسمی تعلیم کے ذریعہ ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اوران کی تربیت کے مواقع سے وہ محروم رہتی ہے۔ پھر جذبۂ امومت سے بھی وہ مالا مال ہوتی ہے۔

ایسی ہی اَن پڑھ ماؤں کو لیڈی ہیلتھ وزیٹرز اور فیملی پلاننگ کی پروموٹرز اپنے کارِ مفوضہ پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسلامی تحریکوں سے وابستہ تعلیم یافتہ خواتین اگر ایک آدھ گاؤں میں جہاں رسائی نسبتاً آسان ہونو جوان ماؤں (اَن پڑھ یا نیم خواندہ) کے جذبۂ امومت کو ننھے بچوں کی غیر رسمی تعلیم پر ابھار سکیں تو ان کی پندرہ بیس روز کی تربیت سے ایک ماڈل گنڈرگارٹن سکول قائم کیا جاسکتا ہے۔ ایسے تجربہ کو حسب استطاعت بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔john Amos Comenius ۱۵۹۲)......۱۶۷۱ء) نے مکتب مادر Mothers School کا تصور دیا تھا۔ اس نے ماؤں کے لیے School of Inafancy نامی کتاب لکھی۔ اس کے منصوبہ میں مکتب مادر کے مرحلہ میں ماؤں کی ذمہ داری تھی کہ بچوں کو پانی، مٹی، ہوا، آگ، بارش، پتھروں، لوہے اور پودوں کا مشاہدہ کرائیں اوران کے خواص اخذ کرائیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، وادیوں، میدانوں اور دریاؤں کے بارے میں معلومات دیں۔

ایک دوسری کتاب The Great Didacitc میں اس نے تجویز کیا:

> ''جہاں تک ممکن ہو ہر شے کو حواس کے سامنے لایا جائے۔ ہر مرئی شے بینائی کے اعضاء کے روبرو لائی جائے۔ ہر قابل شنید شے کو سماعت کے اعضاء کے سامنے، بوؤں (Odours) کو سونگھنے کی حس کے سامنے اور وہ اشیاء جنہیں چکھا جاسکے اور جو چھوئی جاسکتی ہیں انہیں بالترتیب چکھنے کی حس اور چھونے کی حس کے روبرو پیش کیا جائے۔ اگر کوئی شے بیک وقت بہت سے حواس کو متاثر کرسکتی ہے تو اسے زیادہ حواس کے حاسہ میں لایا جائے۔''

کیا عجب ہماری یونیورسٹیوں سے ایم اے ایجوکیشن کرنے والی باہمت خواتین جو اللہ کے فضل

سے دین سے وابستگی بھی رکھتی ہوں اسی کی توفیق سے اس میدان میں کوئی عملی اور مفید کارنامہ کر دکھائیں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

تعلیم اور بین الاقوامی سازش

کیا ہم بری الذمہ ہیں؟

البرہان کے شمارہ جولائی ٢٠١٣ء میں تعلیم اور درسی کتب کے حوالے سے جناب اوریا مقبول جان کی جو آہ وزاری شائع ہوئی ہے وہ ہم پچھلے ٤٠ سال سے کر رہے ہیں۔ حکومت تو خیر اس کا کیا نوٹس لے گی، دینی حلقے اور دینی سیاسی جماعتیں بھی اس معاملے میں اندھی اور بہری نظر آتی ہیں۔ اوریا مقبول جان نے جن درسی کتب میں قابل اعتراض مواد کی نشاندہی کی ہے وہ غیر ملکی نصابات کی درسی کتب ہیں جو غیر قانونی طور پر ہمارے بعض تعلیمی اداروں میں پڑھائی جارہی ہیں یہ تعلیمی ادارے طلبہ وطالبات کو برطانیہ کے اے اور او لیول کے امتحانات دلواتے ہیں۔ حکومت کو ایجوکیشن ایکٹ نمبر ١٠ مجریہ ١٩٧٦ء کے تحت ان درسی کتب اور بیرونی امتحانات پر پابندی لگانا چاہیے تھی لیکن چونکہ مذکورہ امتحانات بیوروکریٹس، متمول تاجروں، جنرلز، ججز اور متعدد سیاستدانوں کی اولاد دیتی ہے اس لیے یہ غیر قانونی عمل شروع ہوا اور جاری رہے گا جب تک ان بااثر طبقات کا معاشرے پر قبضہ جاری ہے۔ مدیر البرہان نے اوریا مقبول جان کے کالم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تو یہ بات کی ہے کہ "بگاڑ کی عالمی قوتوں نے ہمارے نصاب میں دو چیزیں شامل کر دی ہیں یعنی ان کی تہذیب اور فکر کی عکاسی اور اسلامی اصول و اقدار کی نفی" دوسرا یہ ہے کہ "مسلمانوں کو ان کی فکری و تہذیبی بنیاد سے محروم کرنے کی علمبرداران بین الاقوامی قوتوں نے تعلیم کو صوبائی مسئلہ بنا دیا ہے کہ پاکستانی قوم میں فکری یک جہتی نہ رہے نیز انہوں نے اپنے تعلیمی مشیروں اور فروغ تعلیم کے لیے امداد دینے والی ایجنسیوں کے ذریعے پنجاب کے کم فہم لیگی حکمرانوں کو مسحور کر کے انہیں اپنی لائین پر لگا لیا ہے جنہوں نے انگلش میڈیم لازمی قرار دیا ہے اور اردو میڈیم کا خاتمہ کر دیا ہے"

محترم مدیر البرہان نے روایتی طور پر ایک دفعہ پھر سازش تھیوری کا سہارا لیا ہے۔ مقامی گنہ گاروں کو معاف کرتے ہوئے بلکہ ان کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالتے ہوئے سارا الزام بین الاقوامی

ایجنسیوں اور بیرونی حکومتوں پر ڈال دیا ہے۔ اس سوچ میں شاید حقیقت کا کچھ شائبہ ہو مگر اصل حقائق ذرا مختلف ہیں۔ راقم الحراف اپنی سرکاری ملازمت کے دوران غیر ملکی امداد سے چلنے والے متعدد تعلیمی منصوبوں کی پلاننگ، انتظام کاری اور تنفیذ میں بطور متحرک کارکن کے شامل رہا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ اور

☆ ڈائریکٹر الفوز انٹرنیشنل کالج، جوہرآباد (خوشاب)

مشاہدہ بالکل مختلف ہے۔ جہاں تک بعض این جی اوز (NGOs) مثلاً ایکشن ایڈ، سیو دی چائلڈ، عورت فاؤنڈیشن، ساہی، ادارہ تعلیم و آگہی وغیرہ کا تعلق ہے تو ان کا کردار مشکوک رہا ہے اور ان اداروں کو بیرونی فنڈنگ بھی ہوتی رہی ہے اور یہ زیادہ تر اپنی افتادِ طبع اور کچھ بیرونی اثرات کے تحت مغربی تہذیب کے فروغ اور اسلامی طرز زندگی کے خلاف کام کرتی رہی ہیں لیکن جہاں تک بین الاقوامی امدادی اداروں اور ممالک کے درمیان دوطرفہ تعاون کے منصوبوں کا تعلق ہے وہاں اس طرح کی مداخلت یا ڈکٹیشن ظاہراً نظر نہیں آئی کہ نصابات میں کیا تبدیلیاں کی جائیں اور ذریعہ تعلیم کیا ہو؟

میرے علم اور مشاہدے کی حد تک بیرونی امداد سے چلنے والے تعلیمی منصوبوں کے مشیران متنازع معاملات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری بیوروکریسی سیاسی حکومتوں سے جو متنازع فیصلے کروانا چاہتی ہے وہ ان مشیروں کے منہ میں ڈال کر اپنا مطلب نکالتی رہی ہے۔ ماضیٔ بعید اور ماضیٔ قریب میں تعلیمی نظام میں جو غلط فیصلے ہوئے ہیں وہ آمرانہ فوجی حکومتوں نے کیے ہیں یا تعلیم و تربیت سے نابلد خبطِ عظمت کا شکار بیوروکریسی نے کرائے ہیں۔ انگلش میڈیم تعلیم، پرائمری کی سطح پر مخلوط تعلیم اور مخلوط سٹاف، مڈل کی سطح پر عربی ختم کر کے کمپیوٹر کی تعلیم اور اسی نوع کے دیگر غلط فیصلے بیوروکریسی اور جناب شہباز شریف کی سطحی تعلیمی سوچ کی وجہ سے نافذ ہوئے ہیں۔ ہم کسی کی نیت پر شک نہیں کر رہے اور ہمیں یقین ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں ہونے والے سب احمقانہ فیصلے پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کیے گئے ہیں۔ اب ہم اگر مالداری اور ضلعی نظم و نسق کی تربیت کے حامل اور خبطِ عظمت کا شکار ناپختہ حضرات کو تعلیم جیسے نازک اور اہم شعبہ کی منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی پر بٹھائیں گے اور اوپر عجلت زدہ وزیر اعلیٰ ہو گا تو موجودہ صورت حال سے بہتری کی توقع رکھنا عبث ہے۔

تعلیم کے میدان میں فیصلہ سازی کے ضمن میں تعلیم کا پرائیویٹ سیکٹر ایک جبر کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر انگلش میڈیم ہے تو مقابلہ کرنے کے لیے سرکاری اداروں میں تعلیم انگلش میڈیم کرنی پڑے گی۔ پرائیویٹ ادارے شلوار قمیض چھوڑ کر پتلون بش شرٹ کی طرف آئے ہیں تو سرکاری اداروں کی یونیفارم بھی فرنگی زدہ ہو گئی۔ پرائیویٹ تعلیمی ادارے مخلوط تعلیم اور مخلوط سٹاف رکھے ہوئے ہیں تو اب

سرکاری ادارے بھی اسی بھیڑ چال کی طرف چل پڑے ہیں اگرچہ ملکی قانون کی رؤ سے یہ سراسر غیر قانونی ہے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ اگر کسی پرائیویٹ سکول نے محکمہ تعلیم سے رجسٹریشن کرانا ہو تو اس امر کا حلف نامہ دینا پڑتا ہے کہ میرے ادارے میں مخلوط تعلیم نہیں ہے اور نہ ہو گی لیکن خلاف ورزی پرائیویٹ اور سرکاری ادارے سب کر رہے ہیں۔ یہاں تک معاملہ رہتا تو زیادہ دکھ نہ ہوتا لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ سکہ بند دینی اسلامی حلقوں کے سکول اور کالج اس شر میں سب سے آگے ہیں تو صدمہ ہوتا ہے۔ ذرا کوئی الدعوہ سکولز، حرا سکولز، مہناج القرآن ماڈل سکولز، اقرا سکولز، فاران سکولز دارارقم سکولز، عثمان سکولز، اقرا روضہ الاطفال سکولز اور اسلام کے نام پر بننے والی کئی اور سکول چینز کو جا کر دیکھے، ان کے نصابات اور درسی کتب کا مطالعہ کرے، ان کے ہاں مخلوط تعلیم (Co-Education) کے نظارے دیکھے اور ان میں کام کرنے والی خواتین اساتذہ کی حالت زار دیکھے تو پتہ چلے گا کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے اپنے تعلیمی کرتوت ہیں یا بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ اور غیر ملکی ایجنسیوں کی سازش ہے؟ یہ سازش تھیوری ہمارے ہاتھ ایسا ہتھیار آیا ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں سیاہ ترین کرتوت کرنے والے اسلامسٹ، تعلیم کا حلیہ بگاڑنے والے بیوروکریٹس اور تعلیم کو مذاق بنانے والے سیاست دان صاف بری ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو گا جب تک ہم اصل ذمہ داروں کے گلے نہیں دبوچتے۔ اگر ہمارے مذکورہ طبقات درست ہو جائیں تو غیر ملکی ایجنسیاں اور بیرونی امدادی ادارے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور یا مقبول جان صاحب اپنی بیوروکریٹ برادری کو اللہ کا خوف دلائیں۔ مدیر البرہان مولانا ڈاکٹر محمد امین صاحب اپنی مولانا برادری کے لیے قرآن وسنت پر مبنی دین کا صحیح شعور عطا کرنے کے لیے اللہ سے دعا کریں اور راقم الحروف اپنی معلم برادری کو تعلیم کا کاروبار چھوڑ کر تعلیمی دیانت کی طرف متوجہ ہونے کی درخواست کرے تو شاید تبدیلی کی کوئی سبیل پیدا ہو۔

مدیر البرہان نے تعلیم کو صوبائی مسئلہ بنانے کی سازش کا ذکر کیا ہے۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت تعلیم کو کنکرنٹ لسٹ سے نکال کر صوبائی لسٹ میں ڈالا گیا ہے۔ موصوف نے اسے بھی بین الاقوامی ایجنسیوں کی سازش قرار دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اگر پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام وغیرہ جو اٹھارویں ترمیم کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئے ہیں سب بین الاقوامی ایجنسیوں کی آلہ کار ہیں۔ اور ان کی سازش کو کامیاب کرتے ہوئے تعلیم کو صوبائی مسئلہ بنا دیا ہے تو پھر گلہ کس بات کا؟ اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد راقم الحراف نے جماعت اسلامی کے ایک سنیٹیر سے جو آئینی ترمیم کمیٹی کے رکن تھے تعلیم کو صوبائی مسئلہ خاص طور پر نصاب اور درسی کتب پر دفاقی کنٹرول ختم کرنے اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن ختم کرنے پر بات کی تو وہ اس پر بضد تھے کہ یہ فیصلہ درست ہے اور ہم اس کا دفاع کرتے ہیں۔ اب کوئی ڈاکٹر امین سے پوچھے کہ جماعت اسلامی کے یہ سینٹیر بھی کیا بین الاقوامی

ایجنسیوں کی سازش میں معاون تھے؟ البرہان کے اسی شمارے میں ڈاکٹر امین صاحب نے علوم کی اسلامی تشکیل پر ایک جامع مضمون قلم بند کیا ہے۔اس ملک میں علوم ،تعلیم ،نصابات اور درسی کتب کی اسلامی تشکیل کی کہانی بھی ایک روح فرسا کہانی ہے اور اس کہانی کے کرداروں اور گواہوں میں خود ڈاکٹر امین صاحب اور راقم الحروف بھی کبھی اندر اور کبھی باہر اپنا حصہ ڈالتے رہے ہیں۔اس مسئلہ پر گزارشات ان شاء اللہ اگلے شمارے میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

قرآنیات ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک ☆

قرآن اور انسان

اگرچہ کالم نگاری کے میدان میں بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے کئی سال بیت گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بنیادی طور پر ہمارا میدان ادب ہے، بلکہ ادب کے دسترخوان پر بھی ہماری سب سے مرغوب غذا 'خاکہ' ہے۔خاکے کا انگریزی مترادف Sketch ہے۔اصل میں تو یہ تصویری دنیا کا فرد ہے اور چند لکیروں کی مدد سے کسی شخص یا شخصیت کے نقوش ابھارنے کو Sketch کہا جاتا ہے لیکن یار لوگوں نے لکیر کا کام تحریر سے لینے کے عمل کے لیے بھی یہی نام روا رکھا ہے۔اس طرح نہایت مختصر اور منتخب الفاظ میں کسی شخصیت کا احاطہ کرنے کا عمل خاکہ قرار پاتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جہاں قرآنِ معظم کی متنوع برکات سے انکار ممکن نہیں بعینہٖ اس کی کثیر الجہتی سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔انہی میں ایک جہت قرآن کے تخلیقی حسن،لفظی وقار اور ادبی اسلوب کی بھی ہے۔چند سال قبل ہم نے اردو ادب میں تحریر کیے گئے خودنوشت خاکوں کا ایک انتخاب مرتب کیا تو دیباچے میں اس چیز کا بھی اظہار کیا کہ قرآن پاک میں سورۂ اخلاص میں جیسا بھرپور اور جامع خاکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنا بیان فرما دیا ہے،اس کی مثال ممکن نہیں۔اسی طرح اگر قرآن مجید کے موضوعات پہ نظر کی جائے تو اس کا سب سے بڑا مخاطب و مذکور حضرت انسان ہے۔اس میں انسان کے ماضی،حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج اور ترجیحات پہ بھی کھل کے بحث کی گئی ہے لیکن ایک خاکہ نگار کی نظر سے دیکھیں تو اس کا لُبِّ لباب تین جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی قرآنِ مقدس ہی کے تین جملوں میں حضرت انسان کا ایک بھرپور خاکہ دیکھا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے سورہ والتین کی آیت پہ نظر کریں،جس میں چار چیزوں کی قسم کھانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِ [ ] نۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ (۹۵:۴)

قرآنِ معظم میں یہ قادر مطلق کا خاص اسلوب ہے کہ جہاں لوگوں کی توجہ کسی خصوصی مسئلے یا نقطے کی طرف مبذول کروانا مقصود ہو وہاں کسی چیز کی قسم کھا کے بات کی جاتی ہے۔ یہ ویسے بھی انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی حلف یا قسم اُٹھا کے بات کرے، اس کا ذہن فوری متوجہ ہوتا ہے۔ یہاں تو بہ یک وقت چار چیزوں کی قسم کھا کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس انسان کو بہترین انداز میں تخلیق کیا ہے۔ یہ بات اس

☆ ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

ہستی کی طرف سے کہی جا رہی ہے جس کے ایک کُن کہنے سے پوری کائنات وجود میں آ جاتی ہے، جو اس دھرتی کے سینے پہ مہیب پہاڑوں اور لامحدود سمندروں کو جمانے اور پھر انہیں روئی کے گالوں کی طرح اُڑانے اور پلک جھپکتے میں خشک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اب ذرا 'احسن تقویم' کے مفہوم کی جامعیت پہ غور فرمایئے۔ یہاں تو کوئی عام سی کمپنی اپنی کسی معمولی سی پراڈکٹ کے بارے میں کوئی دعویٰ کرے تو وہ بالعموم سچ ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہاں تو دعویٰ کرنے والی ذات خود رب کائنات کی ہے اور جس پراڈکٹ کے بارے میں دعویٰ کیا جا رہا ہے وہ حضرتِ انسان ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس دنیا کی بڑی سے بڑی فرم یا کمپنی اپنی کسی بہتر سے بہتر پراڈکٹ کے بارے میں 'احسن تقویم' جیسے دعوے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ایسا بڑا بول صرف مالکِ اول و آخر ہی کو زیبا ہے۔ آیئے ذرا اس مُشتِ خاک کو احسنِ تقویم کے چاک پہ چڑھا کر اشرف المخلوق بنا ڈالنے کی حقانیت پہ بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انسان کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ربِ کائنات نے فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ زمین پہ اس کے لیے جمادات و نباتات و حیوانات کا پورا نظام ترتیب دیا۔ پانیوں اور ہواؤں کو اس کے تابع کیا۔ بقول شاعرِ مشرق:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں

میر تقی میر نے انسانی عظمت کی کہانی ان الفاظ میں بیان کی تھی:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے

ہیں

آیئے ذرا اس انسان صاحب کے ظاہری و باطنی کمالات پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ قادرِ مطلق نے روئے زمین پر آج تلک کروڑوں، اربوں، کھربوں انسان پیدا کیے ہیں اس طرح کہ سب کے خون کا رنگ ایک ہے، سب کے پاس ایک جیسا باڈی سٹرکچر ہے، سب کو دو آنکھوں، دو کانوں، دو ہاتھوں، دو ٹانگوں، ایک ناک، ایک سر اور ایک منھ سے نوازا ہے لیکن صناعی کا معجزہ ملاحظہ ہو کہ ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جسمانی ساخت مقرر کر دی ہے، اس سے ہٹ کے کسی انسانی ڈھانچے کا بنانا تو بہت دور کی بات، کوئی اور سٹرکچر ذہن میں بھی نہیں آ سکتا یعنی انسان کے جو جو اعضا جسم کے جس جس حصے پر لگا دیئے گئے ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی احاطۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ یہ ہے تخلیق کا کمال...... یہ ہے احسنِ تقویم۔

یہ تو ہے انسان کی جسمانی ساخت کا معاملہ پھر جہاں تک اس کی ذہنی استطاعت کا سلسلہ ہے وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اس نے اپنے اسی ذہن کو استعمال میں لاتے ہوئے کائنات کی تسخیر کا لامحدود سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ کہیں وہ دھرتی کا سینہ چیر کے معدنیات کے خزانوں کا وارث بن گیا اور کہیں سمندر کی کوکھ میں اناج کا رواج قائم کرنے میں کامران ٹھہرا۔ کہیں وہ پرندوں سے بہتر پرواز کرتا ہوا چاند اور مریخ میں سیندھ لگا آیا اور کہیں اس نے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون، فیکس اور برق رفتار طیاروں کے طلسم سے انسانی سوچ سے بھی وسیع دنیا کو ایک گاؤں کی طرح سکیٹر کر رکھ دیا۔ بقول اقبال

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

وہ اپنی ایجادات کے زعم میں اتنا آگے نکل گیا کہ خالقِ کائنات سے یوں مکالمہ کرتا نظر آیا:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

یہ انسانی ذہن ہی کا کمال ہے کہ ہر طرف نئی سے نئی ایجادات کا غلغلہ ہے اور اس کا ولولہ ہے کہ کسی طور پر ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ کائنات ہے کہ اس کے لامختتم عزائم کے سامنے لرزہ براندام ہے۔ ابھی

بھیدی بتاتے ہیں کہ ان ساری مارا ماریوں کے باوجود انسانی ذہن کا دسواں حصہ بھی استعمال نہیں ہوا۔ اسے کہتے ہیں خلقت کا حُسن ــــ اس کا نام ہے احسن تقویم۔

اب ذرا حضرت انسان کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

وَ كَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷: ۱۱)

ترجمہ: 'انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔' یعنی انسان کی مجموعی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے میں سہل پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اپنے فرائض سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے، محنت سے جی چراتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے انسان کی کامیابی کا نسخہ سیدھے سادھے الفاظ میں یوں بیان کیا تھا:

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

حکیم الامت نے بھی حضرت انسان کی دائمی کامیابیوں کے لیے یہی نسخہ تجویز کیا تھا کہ:

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل ! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

یہ 'تعمیرِ خودی' اور 'کوششِ پیہم' کیا ہے؟ یہ وہی ایجنڈا ہے جو خالقِ کائنات نے انسان کی پیدائش

کے ساتھ اسے تفویض کر رکھا ہے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ انسان ہر دور میں اس ایجنڈے کو فراموش کرتا رہا۔ خالقِ کُل بار بار اسے مختلف پیغمبروں اور آسمانی صحیفوں کے ذریعے یاددلاتا رہا۔ ہر زمانے میں انسان کو شرک اور فرموداتِ ربانی کی خلاف ورزی سے منع کیا جاتا رہا۔ اور محنت اور صبر کے میٹھے پھل کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن یہ وقتی اور ظاہری مفادات کے حصول کے نشے میں ہمیشہ عجلت پسندی کا شکار نظر آیا۔ اس نے نفس اور شیطان کی تابع فرمانی میں ہمیشہ فرائضِ منصبی کو پسِ پشت ڈالے رکھا۔ اس نے اپنے لکھے رزق کا انتظار کرنے کی بجائے رشوت، ملاوٹ، لُوٹ مار اور بے ایمانی کو ترجیح دی۔ اسے جہاں ذرا اختیار ملا، کچھ شوکت نصیب ہوئی، یہ خدا کا شکر بجالانے کی بجائے خود خدا بن بیٹھا۔ کہیں سے ذرا تکلیف پہنچی تو اسے اپنے کیے کا پھل یا خدا کی طرف سے آزمائش سمجھ کر برداشت کرنے کی بجائے خدا کا شاکی بن گیا۔

منہ سے یہ ہمیشہ 'اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ' پکارتا رہا لیکن عملی طور پر درباروں، مزاروں اور دنیاداروں سے مدد طلب کرتا نظر آیا۔ خدا کے دیے رزق، اولاد اور عزت کو دوسروں سے منسوب کرتا دکھائی دیا۔ پیغمبروں کے اعمال اور قرآنی اقوال سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے خود کو عقلِ کُل سمجھے رہا۔ تادمِ مرگ آخرت کی بجائے دنیا کا طالب بنا رہا۔ کبھی دکھ تکلیف میں خدا یاد آجاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے ازالے کے لیے بھی دنیاوی سہارے ڈھونڈ لیے۔ بقول اکبرالہ آبادی:

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

حضرتِ انسان کی اسی جلد بازی، عجلت پسندی، محدود سوچ اور کمزور عقیدے ہی کے پیشِ نظر ارشاد فرمادیا گیا:

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ (۱۰۳: ۱، ۲)

یہاں زمانے کی قسم کھا کے واضح کر دیا گیا کہ انسان اپنی اسی جلد بازی، ڈھٹائی، ہٹ دھرمی اور کمزوری ایمان کی بنا پر سراسر گھاٹے کی طرف جارہا ہے۔ ساتھ ہی یہ وعید بھی سنادی کہ اب بھی اگر اس کی بچت کی کوئی صورت ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ پر پختہ ایمان اور صبر وتوکل ہی کی بنا پر ممکن ہے۔

آج اگر انسان کو دنیا میں خواری کا سامنا ہے تو انہی صفات سے محرومی کی بنا پر ہے۔ وہ ایک اللہ کو اپنا دست گیر، داتا اور مشکل کشا ماننے کی بجائے جگہ جگہ سر جھکاتا دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس پیچیدہ مرض کا بڑا شافی علاج بتایا تھا کہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

وہ خدا جو فرماتا ہے کہ میں انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں، میں وہ بات بھی جانتا ہوں جو اس کے دل کے نہاں خانے میں پوشیدہ ہے۔ وہ جو فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی اور رک رک کر نکلتے پانی سے پیدا کیا اور کبھی کبھی انسان کو اس کی اوقات یاد کراتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ تم میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ کوئی مچھر تمہارے کھانے میں سے ایک ذرا اٹھا کے لے جائے تو اس سے واپس لے سکو، پھر زمین پہ اکڑ کڑ کر کیوں چلتے ہو؟ کیا آسمانوں کو گرا دو گے یا زمین کو پھاڑ دو گے؟

ان تمام حقاق سے ثابت ہوتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے انسان کو بڑی محبت، فنکاری اور بہتر توقعات کے ساتھ پیدا کیا اور اس کو عاجزی، ایمان، صبر اور خیر کی تلقین کی۔ لیکن انسان اپنی جلد بازی، فوری فائدے کے حصول اور کمزور ایمان کی بنا پر شیطان کے بہکاوے میں آ کے گمراہی، تکبر، شرک اور دنیاداری کی دلدل میں جا پڑا۔ میرزا غالب نے انسان کی اسی ابتری کے پیشِ نظر یہ سوال اُٹھایا تھا کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

بات خاکہ نگاری سے شروع ہوئی تھی کہ خاکہ اشاروں کا فن ہے، جس میں چند جملوں میں کسی شخصیت کے عیوب و محاسن کا احاطہ کر دیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کے ان تین جملوں میں بھی حضرت انسان کا تمام کچا چٹھا بیان کر دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ خدا کے احسان کا کیا عالم ہے؟ خود اپنے ساتھ اس کا سلوک کتنا عجیب ہے؟ اور اس کا نتیجہ کیسا خوف ناک ہے؟ شاعر مشرق نے اپنے ایک شعر میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور ذلتِ موجودہ کا سبب کتنی خوبصورتی سے بیان کر دیا تھا:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

جو عالم ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ
(اقبالؒ)

دعوت وتبلیغ

الدكتور محمد امين رحمة☆

إمكانيات الدعوة في الألفية الثالثة

من الممكن أن يختار الرجل منهجين بمشاهدة الأوضاع التي يمربها العالم الإسلامي اليوم، إما منهج اليأس والقنوط إذا نظر إلى ضعف المسلمين وخبث أعدائهم ورداءة أوضاعهم، وإما منهج الأمل والرجاء على الرغم من كل هذه الظروف، ونجد أن المنهج الثاني هو الصواب، لأن المسلم الحق لايمكن أن يكون قنوطا[١] لأنه يؤمن بأن ربه هو الحي القيوم[٢]، مالک الأرض والسماء[٣] ولايسقط الورق إلابعلمه وبمشيئته[٤] وبأنه هو الرحمن الرحيم[٥] وما النصر إلا من عندالله[٦] فمن يؤمن بهذه العقائد عليه أن لا يقنط، بل عليه أن يجتهد بما في وسعه ويترک النتيجة على الله سبحانه و تعالىٰ ويرضى برضائه وبمشيئته۔

وإذا كان الرجل متفائلا يظهر الإمكانيات الخفية ويبذل كل ما في وسعه لأداء واجبه ويثق برحمة ربه، فتغطيه نصرة ربه فينجح ويفوز ويسعد۔

وإذا نظرنا إلى القرون المتأخرة من الألفية الثانية الميلادية وجدنا أن المسلمين فقدوا حريتهم وسقطوا في قعر الذل والمسكنة حيث استعبدهم الاستعمار الغربي، ولكننا في نفس الوقت إذا أمعنا النظر في القرن الماضي رأينا أن الليث قد انقض من النوم وبدأ يتحرک إلى اليمين واليسار ويفک سلسلة الذل والعار۔

ومهما كانت ظروفنا رديئة وسيئة، علينا أن لاننسى واجبنا وهو بلاغ الدعوة وأداء شهادة الحق إلى الناس لأن الله عزوجل أعزنا بخاتم النبوة(۷) وأنزل علينا كتاباً كريماً وجعلنا خير أمة حيث قال في كتابه العزيز:

'كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍأُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔'(۸)

ولكننا للأسف لم نؤدهذا الحق كما كان ينبغي علينا، نعم! قديكون لدينا أعذارنا، ولكننا على الرغم من هذه الأعذار نقول "ماأدينا واجبنا ونحن مسؤلون عن هذاالتقصير"۔

٭الاستاذبقسم الفكر والحضارة الاسلامية جامعه الادارة والتكنولوجية بلاهور
والامين العام لمجلس الملى الشرعى والرئيس لحركة اصلاح التعليم بلاهور

وشهادة الحق وجهان يرتبط أحدهما بالآخر، هما خارجي وداخلي، أما الوجه الداخلي فيتعلق بشخصية الداعية ومسئولياته ومؤهلاته۔ وأما الوجه الخارجي فنقصد منه أنه إذا أراد الداعية إبلاغ الدعوة في مجتمع ما، فعليه أن يدرس أولا ظروف هذا المجتمع السياسية والدينية والاقتصادية...الخ... دراسة عميقة مستفيضة متأنية- حتى يستفيد من إمكانياتها ويحذر من سلبياتها۔ وفي هذه المقالة نود أن نشير إلى بعض الإمكانيات المثبتة إذا أرادنا إبلاغ الدعوة إلى مجتمع معاصر لاسيما المجتمع الغربى- ونعني به الأوربي والأمريكي- ولعل من أهم هذه الامكانيات وجود العطش أو ألفراغ الروحي في ذلک المجتمع۔

وإذاحاولنادراسةهذاالفراغ وجدناأن له سببين:

الأول: إن هذا المجتمع محروم من دين سماوي حقيقي حيث النصرانية هي الديانة المنتشره في هذا المجتمع ونعرف من أصدق رجل في العالم ومن أصدق كتاب على صفحة الأرض بأن هذه الديانة محرفة مزيفة(۹) ولاتحتوي أبدا على ماأنزل الله سبحان وتعالى على نبيه عيسى ابن مريم- رضي الله عنهما- حيث تدعو إلى التثليث بدل التوحيد وترى أن نبيهم ليس عبدا بل هو جزء غير منفک من عناصر ألوهية، وتدعو أيضا إلى الرهبانية وكفارة المسيح وطبقة خاصة لقسيسين وغيرها من العقائد الباطلة، وأكبر من كل ذلک ليس لديهم الكتاب الذى أنزل الله على عيسى ابن مريم- رضى الله عنهما- بل

الأناجيل الموجودة هي ككتب التاريخ والسير ودونت بعد مارفع الله المسيح اليه۔ واذا هذه هي أوضاع النصرانية فكيف تطمئن قلوب الناس بهذه الديانة، وهل يهوي قلب الصبي الى غير أمه؟

والأمر الذي زاد العطش الروحي في أوربا وأمريكا هو أن الناس إذا لم تمل قلبهم الى الديانة المزيفة رجعوا الى الأفكار الوضعية التي ملأت هذا الفراغ الفكري وجعلوها كالديانة الملزمة في حياتهم اليومية۔ ولا يكون خاليا من الفائدة إذا أشرنا إلى بعض هذه الأفكار:(۱۱)

☆ منها العلمانية (SECULARISM) التى تعني أن سلطة الله سبحانه وتعالىٰ لا تتجاوز عن الأمور الشخصية للناس۔ أما الأمور الاجتماعية فلا حق لله تعالىٰ أن يتدخل فيها۔

☆ منها المادية (MATERIALISM) أي الحياة هي الدنيا فتستحق أن تكون أكبر همّ الرجل، وترجح على الأمور الأخرى كلها (ولآخرة)۔

☆ ومنها البشرية (HUMANISM) التى تعني أن الانسان خلق حرا ويحق له أن يفعل مايشاء، وأنه ليس عبدالله بل الهه هواه ويصنع مايريد۔

☆ ومنها القومية والديمقراطية: ومعنى القومية أن سبب العصبية هو الوطن والنسل واللون بدل الدين، ومعنى الديمقراطية أن الناس أحرار، والبرلمان الذي يشتمل على نوابهم له الحكم المطلق فيسطتيع أن يحلل الحرام ويحرم الحلال بدون شرط أو قيد، فحللت فعلا البرلمانات الغربية شرب الخمر والزنا بالرضا واللواط وغير ذلک من الأمور القبيحة۔

☆ منها الرأسمالية المبنية على الربا والتي ترجح المال على الانسان وكسبه۔

☆ ومنها الاشتراكية التي تنكر الدين وحرية الفرد وتجعل الناس عبيد اللدولة من أجل لقمة العيش۔

☆ ومنها النشوية (DARWINISM) التي ترى أنه لا فرق بين الانسان والحيوان لأنه تطور من قرد، وأن الانسان لا خالق له الى إلا طبيعة۔

☆ ومنها الفرويدية (FREUDISM) التي ترى أن غريزة الجنس هي التي تسيطر على

جميع أحوال الانسان ولا يستطيع أن يصلح أحواله لأنه رهن لغريزته الحيوانيه۔

والمعروف أن حياة الفرد في الغرب تبنى على هذه الأفكار الهدامة وهي أساس للتعليم والتربية في المدارس والجامعات وأساس الفكر والعمل في الحياة الشخصية والاجتماعية۔ وكانت نتيجة هذه الأفكار الوضعية الباطلة تدمير الهيكل العام للمجتمع، فاهتزت الحياة العائلية بكثرة الطلاق والزنا واللواط والازدواج والأولاد بدون نكاح۔ وانتشرت الخمور والمخدرات والجنايات في المجتمع، وأصبحت الدنيا ولذاتها أكبر همّ الرجال والنساء ونسي الناس الشكر والتوبة والقناعة والمعروف بكل أنواعه وانتشرت المنكرات والنواهي۔ وكانت من نتيجته كثرة الأمراض الذهنية بسبب الضغط والهموم والقلق والخيبة والتوتر، وأصبحت الحياة عبئًا وضيقًا، وصدق الله سبحانه وتعالیٰ حين قال: "ومن أعرض عن ذكري فان له معيشة ضنكا"(١٢) حيث بدأ الناس في الغرب يقلتون أنفسهم فرادى وجماعات۔

وأصبح العطش الروحي فراغا واضحا في المجتمع الغربي حتى أصبح يراه كل من ينظر جليه فتدفق إلى الغرب علماء الهنود (GURU) وحاولوا أن يجذبوا أهله الى سرية الشرق۔ وفي مثل هذه الحالات تزداد مسئولية المسلمين، ويجب عليهم ابلاغ دعوة الاسلام إلى تلك المجتمعات بكل قوة، ولو لم يفعلوه قد تعد ذلک جريمة كتمان الحق وقد تؤدي إلى سخط الله سبحانه وتعالی۔

هذا هوا الوجه الخارجي للدعوة، أما الوجه الداخلي فحان الوقت أن نتكلم فيه بالاختصار، وهو عبارة عن مسئوليات الدعاية وعن استراتيجيته في إبلاغ الدعوة، ونود أن نشير هنا الى أمور ثلاثة مهمة۔

أولها: لا يكفي الحوار والكتابات والجلسات والمناقشات، لأن الناس ينظرون الى سلوک الخطيب وأخلاق الكاتب، فلا بد من عمل نموذ جي على مستوى الفرد والمجتمع۔ وهكذا فعل أصحاب النبي رضوان الله عليهم أجمعين، واذا هجموا على الشام والفرس لم يسئلهم أحد "ما الاسلام ومن المسلمون؟" لأن كل مسلم كان خلقه معروفا وكان سلوكه معروفا وكان مجتمع المدينة مشرقا ومضيئا مثل الشمس الساطعة منذ أكثر من ألف ميل۔ أما الآن اذا دعونا رجلا إلى الإسلام وهو يسألنا عن الإسلام فنشير الى الكتب

وإذا سئلنا "أين المجتمع الإسلامي الحي؟" فلا جواب عندنا! كما قال برنارد شا- الأديب الانجليز الشهير في القرن الماضي-: "عندما أقرأ عن الاسلام في الكتب أود أن أسلم وعند ما أنظر المسلمين أود أن أبقى مسيحيا"(۱۳) فلابد من عمل نموذجي على مستوى الفرد والدولة، وهذا يحتاج الى جهد شاق۔ فلا بد من تغيير مناهج التعليم والتربية ودور وسائل الاعلام وتثبيت العقيدة في القلوب والأذهان وتزكية النفوس وتوحيد الشعوب والقيادات السياسية حتى تصبح الأمة بنيانًا مرصوصًا ومتينًا۔

ثانياً: لا بد من ابلاغ الدعوة على مستوى فكري وعلمي عال باستعمال أحدث الوسائل التكنولوجية الاعلامية حسب قول الله سبحانه وتعالیٰ: "أدع الى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن"(۱۴) حتى نقنعهم ونثبت لهم علو الاسلام وندعوهم الى الدين الذي تطمئن به القلوب وترضى به العقول بانه دين الهي ودين فطري۔

ثالثها: لعل أهم وأكبر حاجز في فهم الاسلام - فهمًا صحيحًا - ونشر الدعوة الاسلامية وتبليغها - تبليغًا جيدًا - عند أهل الغرب هو دعاية مزيفة ضد الاسلام والمسلمين من الصهاينة وأصدقائهم في الحكومات والمنظمات باستعمال أحدث وسائل الاعلام، وهدفهم ايجاد جو البغض والكراهية ضد الاسلام والمسلمين حتى لا تسمع شعوبهم عن الاسلام شيئًا بأذن سامعة وعين باصرة وقلب واعي ويطرحونه بلا تفكير۔ ولسوء الحظ هم الناجحون في هذه المؤامرة حتى الآن۔ فلابد للمسلمين أن يواجهوا هذه الظاهرة الخطيرة ويجاهدوا جهادً كبيرًا لفک سلاسل العبودية حتى يستطيع كل فرد من أهل الغرب أن يدرس الاسلام على استحقاقه ثم "ليهلک من هلک عن بينة ويحى من حي عن بينة"(۱۵)

وأخيرا نقول بكل ثقة بأنه اذا أدينا واجبنا تجاه الدعوة الاسلامية، حكومةً وشعبًا، وطلبنا نصرة الله وولائه بكل اخلاص وجدّ، فالوقت ليس بعيدًا اذًا - كما أنشد اقبال:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

أي ان ظلام الليل سوف يولي هاربا أمام اشراق الشمس وسوف يدوي نشيد التوحيد في جو هذه الروضة - وما ذلک على الله بعزيز۔

المراجع

۱۔ الزمر ۳۹۔۵۳
۲۔ آل عمران ۳:۲
۳۔ البقرہ ۲:۲۵۵
۴۔ الانعام ۶:۵۹
۵۔ الفاتحہ: ۱:۳
۶۔ الانفال ۸:۱۰
۷۔ آل عمران ۳:۱۰۴، البقرہ ۲:۱۴۳
۸۔ آل عمران ۳:۱۱۰
۹۔ النساء ۴:۱۸۱، التوبۃ ۹:۳۰
۱۰۔ الاستاذ ابو زھرہ، محاضرات فی النصرانیۃ، مطبعۃ المدنی، القاھرہ، ۱۹۷۷م
۱۱۔ راجع لدارسۃ الافکار الغربیۃ المعاصرۃ علی سبیل المثال

1. Kurts Paul, Forbidden Fruit: The Ethics of Hunamism (Tr. Philip Mairet)
2. Summervile John: The Secularization of Early Modern England, Oxford University Preas, 1992.
3. Sudrew Cheywood: Political Ideas and Concepts: An Introduction, McMillan, Hampshire, 1994.
4. Dobxhansky, Theodosus, Mankind Evolving, Yales University Press, 926.
5. F. Copleston, A History of Philosophy, Image Books, New York, 1961.
6. Draper, J.K., A History of the Intellectual Development of Europe, London, 1891.

۱۲۔ طہ ۷:۱۲۴
۱۳۔ خالد کمال مبارکفوری، برنارشا درنقوش رسول نمبر، ج ۴ ص۔ ۵۵ ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۸۳م
۱۴۔ النحل ۱۷:۱۲۵

۱۵۔ الانفال ۸: ۴۲

اسلام اور مغرب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مغربی تہذیب خالص جاہلیت ہے

البرہان کے پچھلے ماہ کے شمارے میں ہم نے مولانا وحیدالدین خان کا مقالہ 'فکر مغرب' شائع کیا تھا جس میں انہوں نے مغربی فکر کو عین اسلامی قرار دیا تھا۔ اس ماہ ہم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ایک مضمون اس موضوع پر دے رہے ہیں۔ یہ دراصل ایک مقالہ ہے جو مولانا نے ۱۹۴۱ء میں اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھا تھا اور 'اسلام اور جاہلیت' کے عنوان سے طبع ہوتا رہا ہے۔ یہ اُس مقالے کا ابتدائی حصہ ہے جو فکرِ مغرب سے متعلق ہے۔ عنوان البتہ ہمارا ہے۔ مدیر

انسان کو دنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اُس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک وہ اس چیز کی ماہیت و کیفیت اور اپنے اور اس کے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہر حال اُسے ان اُمور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کرنا پڑتی ہے اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کرلیتا یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میں اس کے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویہ اختیار کروں۔ یہ آپ کا شب و روز کا تجربہ ہے آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپ کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپ کو اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہر حال آپ کو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان اُمور کے متعلق قائم کرنا پڑتی ہے اور جو رویہ بھی آپ اس کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپ کے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جنہیں آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں، جن کی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل بھی اُس رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات و صفات اور اپنے ساتھ اُن کے تعلق

کے بارے میں قائم کیا ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُس کے صحیح ہونے پر آپ کے رویہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپ کے رویہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے اور خود اُس رائے کی غلطی وصحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے وہ رائے علم کی بنا پر قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسّی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوب صورت چمک دار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اُس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اُسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اس کے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ میرا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اس کے آگے سرِ نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر اس کی ماہیت اور اس کی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم وتحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے، جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود بلکہ اس سے حسب موقع پکانے، جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ ان مختلف رویوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویے جاہلیت کے رویے ہیں، کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربہ سے غلط ثابت ہو جاتی ہے اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے، کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بخلاف اس کے، آگ سے خدمت لینے والے کا رویہ علمی رویہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اس کی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو موجود پاتا ہے۔ اس کے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین وآسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے۔

جس میں بے حد وحساب اشیاء ہیں اور وہ اِن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اس کے گرد وپیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں، ان سب سے اس کی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپ کے نزدیک یہ بات قابل تصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کرسکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں اور ان کے ساتھ

اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کرسکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار؟ خودمختار ہوں یا ماتحت؟ ماتحت ہوں تو کس کا اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے؟ میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کرسکتا ہے؟ جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اس کی اپنی مِلک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں؟ ان کا حساب لینے والا کوئی ہے یا نہیں؟ اور ان کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا وہ اپنے گردوپیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کرسکتا ہے؟ جب تک اس امر کا تعین نہ کرلے کہ ان اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور؟ ان پر اس کے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود؟ اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ اس میں اپنے ابنائے نوع کے برتاؤ کی کوئی شکل متعین کرسکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرلے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے؟ انسان اور انسان کے درمیان فرق وامتیاز کی بنیاد کیا ہے؟ اور دوستی و دشمنی، اتفاق واختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن اُمور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دنیا کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کرسکتا ہے؟ جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے اور اس میں میری حیثیت کیا ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، اس کی بنا پر بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام اُمور کے متعلق ایک نہ ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الحقیقت ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کررہا ہے ان سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے ان سوالات پر فلسفیانہ غوروفکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کرکے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو، نہیں بہت سے آدمیوں کے ذہن میں ان سوالات کی سرے سے کوئی متعین صورت ہوتی ہی نہیں، نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہر آدمی اجمالی طور پر ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اس کا رویہ جو بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُس رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کسی نظامِ تمدن وتہذیب اور کسی ہیئت

اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ عمل بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کرلیا جائے اور ان کا جواب جو بھی متعین کیا جائے گا اس کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کرے گا جیسا اس کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخالف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائٹی کا، بہرحال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کرے گا، جو ان سوالات کے جوابات کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویہ کا تجزیہ کرکے بآسانی یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ اس رویہ کی تہ میں زندگی کے ان بنیادی سوالات کا کون سا جواب کام کررہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے کہ کسی شخص یا اجتماعی رویہ کی نوعیت کچھ ہو اور ان سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویے کے درمیان تو ضرور ہوسکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اس کی نوعیت اور عملی رویہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جن کے متعلق ابھی آپ نے سنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب اُمورغیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہوا نہیں ہے کہ ہر انسان دنیا میں آتے ہی اُسے پڑھ لے اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہوجائے۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ ان کے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے انہیں حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں حل کرنے کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا کیا صورتیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں۔

ان کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان اُمور کے متعلق ایک رائے قائم کرلے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسّی کے ساتھ وہم وقیاس کو ملاکر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان

مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اُسے قبول کر لیا جائے۔

دنیا میں اب تک ان مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے ان مسائل کو حل کرتی ہے۔ ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام حلوں میں پیدا کردہ رویوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں دِکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلتے ہیں، اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود وظہور ہے جس کے پیچھے کوئی مصلحت اور مقصد نہیں۔ یوں ہی بن گیا ہے، یوں ہی چل رہا ہے، یوں ہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہٰذا وہ یا تو ہے ہی نہیں اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شاید اتفاقاً پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اسے کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے۔ جنہیں پورا کرنے کے لیے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قویٰ اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کے گردوپیش زمین کے دامن پر بے حد وحساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے اور اس کی قوتوں کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اپنی خواہشات وضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے اور دنیا کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ کوئی صاحب امر نہیں جس کے سامنے انسان جواب دہ ہو، اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ وقانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے اس کے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگزشت میں، یا خود اپنی تاریخ کے تجربات میں ہے اور یہ اگر کسی کے سامنے جواب دہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے ہے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے

نتائج اِسی زندگی کی حدتک ہیں۔لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریۂ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسّی مشاہدہ پر دیا گیا ہے اور اس جواب کا ہر جزو دوسرے جزو کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط اور ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا میں ایک ہموار و یکساں رویہ اختیار کرسکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔اب اُس رویہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نگاہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خودمختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرلے۔وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھے گا، اس لیے اپنے حسب منشا جس طرح چاہے گا انہیں استعمال کرے گا۔دنیا کی جو چیزیں اس کے قبضۂ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اسے اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کرے گا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانین قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔خود اس کے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس، ذمہ داری کا احساس اور کسی باز پرس کا خوف......نہ ہوگا جو اسے شُترِ بے مہار ہونے سے روکتا ہو۔جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو، وہاں تو اس کے عقیدے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ وہ ظالم، بد دیانت، شریر اور مفسد ہو۔وہ فطرتاً خودغرض، مادہ پرست اور ابن الوقت ہوگا۔اُس کی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا اور اس کی نگاہ میں قدر و قیمت صرف ان چیزوں کی ہوگی جو اُس کے اس مقصد زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دوراندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہم درد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔لیکن جب آپ اس کے اس رویہ کا تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اس کی خودغرضی ونفسانیت ہی کی توسیع ہے۔وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اس کی بھلائی چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہوسکتا ہے۔

پھر جو سوسائٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُس کی امتیازی خصوصیات یہ ہوں گی:

سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جا سکے وہ بس دولت مشترکہ (Common Wealth) کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون ساز انسان ہوں گے، تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائیں گے اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے ابھر آئیں گے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ چالاک، مکار، جھوٹے، دغا باز، سنگ دل اور خبیث النفس ہوں گے۔ سوسائٹی کی راہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی اور ان کی کتابِ آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔

تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائے گی اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیے جائیں گے کہ ان کی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم از کم رکاوٹ ہو۔

اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہوں گے اور ان کے اندر عریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائیں گے۔

معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرِ عروج آئے گا، کبھی سرمایہ داری نظام اس کی جگہ لے گا اور کبھی مزدور شورش کر کے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لیں گے۔ عدل سے بہر حال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ دنیا اور اس کی دولت کے بارے میں اس سوسائٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جس پر حسب موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے۔

پھر اس سوسائٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام ہوگا اس کا مزاج بھی اسی تصورِ حیات اور اسی رویہ کے مناسب حال ہوگا۔ اس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دُنیا، انسان اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائے گا جس کی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، انہیں ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائیں گی کہ آپ سے آپ اُن کے ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہو جائے اور پھر ساری تربیت اس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ آپ لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درس گاہوں میں آپ تعلیم پا رہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں، اگرچہ ان کے نام اسلامیہ کالج اور

مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جس کی تشریح میں نے ابھی آپ کے سامنے کی ہے خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اس کی نوعیت وہی ہے جو اُس بچہ کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسّی مشاہدے پر اعتماد کر کے آگ کو ایک خوب صورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربہ سے ظاہر ہو جاتی ہے کیوں کہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں کیوں کہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اس کی آنچ دھیمی ہے، فوراً چرکا نہیں دیتی بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانی، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافی، مال داروں کی خود غرضی اور عام لوگوں کی بد اخلاقی کا جو تلخ تجربہ اسے ہوتا ہے اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ و فساد، ملک گیری اور اقوام کشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، ان کے چرکوں سے وہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے، علمی رویہ نہیں ہے، کیوں کہ انسان نے اپنے متعلق اور نظامِ کائنات کے متعلق جو رائے قائم کر کے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امر واقع کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ برے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٔ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے

کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اسلام اور مغرب　　مولانا حذیفہ دستانوی

مغربی تہذیب کے فتنوں سے ایمان کیسے بچایا جائے؟

اللہ رب العزت نے ہمیں انسان کی صورت میں وجود بخشا، یہ اللہ کا عظیم انعام ہے۔ اللہ کی مخلوق میں انس وجن ہی مستحق جزاء وسزاء ہیں اس لیے کہ اللہ نے انسان کو قوتِ ارادہ عطا کی، پھر عقل دی (جس سے وہ خبیث وطیب میں تمیز کر سکے اور اپنے نفع ونقصان کو سمجھ سکے) اور اسے ہدایت وضلالت کے درمیان امتحان کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا جنھوں نے وحی کی روشنی میں ہدایت کی راہیں بتائیں۔ انبیاء کے سلسلے کو احمدِ مصطفی محمد مجتبیٰ ﷺ پر ختم کیا۔ آپ ﷺ پر انتہائی جامع وحی نازل کی، جس میں انسان کو اللہ سے مربوط رکھنے کے لیے عقائد کی تعلیم، اللہ کی مرضیات کے مطابق قول وفعل کے لیے احکامِ فقہیہ کی تعلیم، اخلاق کی درستی کے لیے تزکیۂ نفس کی تعلیم، حقوق العباد و الحیوان کے لیے معاشرت کی تعلیم اور کسبِ حلال کے لیے معیشت کی تعلیم کو مکمل جامعیت و مانعیت کے ساتھ عطا فرمایا۔ اس نے ''اشراط الساعۃ'' کے عنوان سے قیامت تک امت کو پیش آنے والے فتنوں اور اخبار سے مطلع کیا۔ غرضیکہ ان تمام امور کی تعلیم دی گئی جو انسان کی دنیوی ضرورت کو بہ حسن وخوبی پورا کرنے کے ساتھ ساتھ آخرت کی کامیابی کی مکمل ضامن ہو۔ جب تک امت نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتی رہی دنیوی کامیابیاں اس کی قدم بوسی کرتی رہیں مگر جہاں امت نے تعلیماتِ نبویہ سے انحراف کیا اور اپنی خواہشات کے مطابق قرآن وحدیث کی باطل تاویلات کرنی شروع کیں تو اللہ نے ان کو ہر طرح کی دنیوی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا (وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین) ''تم ہی سربلند رہو گے اگر صفتِ ایمان کے ساتھ متصف رہو گے۔''

مقصد حیات

مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور وفکر کی ضرورت ہے کہ ان کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور آج کا انسان اس مقصدِ حیات کو پس پشت ڈال کر کہاں جا رہا ہے؟

لوگوں کا عجیب حال ہے۔ ایسے زندگی گزار رہے ہیں جیسے مرنا ہی نہیں ہے اور زندگی کا حساب دینا ہی نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں مسلم امور میں سے ہیں۔ نہ موت سے کوئی بچ سکتا ہے اور نہ حساب و

کتاب اور جزا وسزا سے۔ مغرب نے مادّیت یعنی دنیا پرستی کو لوگوں کے ذہن ودماغ پر ایسا مستولی کردیا ہے کہ دینی علم اور فکرِ آخرت میں رسوخ کے بغیر دنیا پرستی سے بچنا انتہائی دشوار ہے۔ اہل مغرب یعنی یہود و نصاریٰ نے حبّ دنیا کو ذہن ودماغ پر مسلط کرنے اور آخرت سے غافل کرنے کے لیے زبردست پلاننگ کی اور دنیوی تعلیم میں لوگوں کو ایسا مشغول کیا کہ دینی تعلیم کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ اور جو فرصت کی گھڑیاں تھیں ان میں انسان کو ذرائع ابلاغ کے جال میں پھنسا دیا اور ٹیلی ویژن، اخبار بینی، کھیلوں، ڈرامہ سیریلز، ناچ گانے اور مختلف کلچرل پروگراموں میں ایسا مشغول کیا کہ دین کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ نہ دین سیکھنے کی فرصت ہے اور نہ دین پر عمل کرنے کے لیے وقت۔

دنیوی تعلیم پر مادی افکار کا غلبہ

دنیوی تعلیمی نصاب میں اگر صرف فن اور ہنر پر اکتفا کیا جاتا تو کوئی بری بات نہ تھی مگر ہماری حکومتوں نے اس میں مادّی افکار کا زہر اور اس کے ایمان سوز اثرات، اعتقادات اور مغربی تہذیب و ثقافت کو بھی شامل کرلیا، قصداً تعلیمی نصاب میں مادّی افکار کو فروغ دیا۔ دین و مذہب کو انسان کی زندگی سے دریا برد کردیا اور خواہ مخواہ یہ ثابت کیا کہ ''مذہب'' انسان کا ذاتی ونجی مسئلہ ہے (جب کہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا) اور اجتماعی زندگی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس فکر کو فروغ دینے کے لیے 'سیکولرزم' (Secularism) کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انسان کو نجی زندگی میں مذہب سے دور رکھنے کے لیے 'ہیومنزم' (Humanism) کو فروغ دیا۔ انسان کو یہ تعلیم دی کہ وہ مختارِ کل ......اور العیاذ باللہ اسے اپنی زندگی گزارنے میں کسی خدائی پابندی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے 'میٹریلزم' (Materialism) کو فروغ دیا اور اس کے ذریعہ انسان کو یہ بتانے کی سعی نامسعود کی کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، لہٰذا دنیا کی کامیابی کی کوشش ہی میں مشغول رہنا ہے، العیاذ باللہ۔ آخرت کی زندگی کس نے دیکھی؟ اور پتہ نہیں مرنے کے بعد زندہ ہونا بھی ہے یا نہیں؟ لہٰذا جو کچھ کرنا ہو سب دنیا ہی کے لیے کرو۔ اپنی ہر چیز کو دنیا کی کامیابی کے لیے قربان کردو۔ اپنا مال، اپنی جان، اپنا وقت، اپنی اولاد سب کو دنیا پرستی میں مشغول کردو۔ اللھم احفظنا من الفتن۔

یہود و نصاریٰ کی شیطنت نے اپنے شیطانی ایجنڈے کو مزید استحکام دینے اور عوام و خواص کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے اور وحی الٰہی کی حیثیتِ حاکمہ کو ختم کرنے کے لیے 'امپریسزم' (Empiricism) کو فروغ دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جو کچھ حقیقت اور حقائق کا ادراک ہوتا ہے محض مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا عقل، حس، تجربہ اور مشاہدہ ہی اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں،

العیاذ باللہ۔ اس کے لیے کسی 'نبی' اور 'رسول' کی تصدیق کرنے اور اس کی بات پر اعتماد کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی خطرناک حربہ سے ان شیطان نما انسانوں نے عورت کو آزادی دلائی، جو آزادی نہیں بربادی کا باعث ہوئی۔ آج دنیا کے حالات اس پر گواہ ہیں اور جب عورت گھر سے بے پردہ ہو کر باہر آئی تو اس کے کیا نتائج سامنے آئے؟ جنسی اباحیت، عریانی، فحاشی، زناکاری کو عام رواج حاصل ہو گیا۔ دنیا میں زناکاری کے لیے لائسنس جاری ہونے لگے، مرد اور عورت کی رضامندی سے ہونے والے زنا کو زنا کی فہرست ہی سے خارج کر دیا، جس کے سبب یورپ و امریکہ میں خاندانی نظام جو تباہ ہوا، وہ دنیا والوں کے سامنے ہے۔ گویا 'من حفر بئرا لأخیہ وقع فیہ' کا مغرب صحیح مصداق ٹھہرا کہ جو اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے خود ہی اس میں گرتا ہے اور 'لبرلزم' (Liberalism) کے ذریعہ مذکورہ نظریہ کو مزید تقویت دی گئی۔ اب بھی اگر انسان اہل مغرب کے اس منصوبہ کو سمجھ کر رد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے لیے خیر ہے ورنہ ہلاکت کے سوا کچھ ہاتھ آنے والا نہیں۔ 'خسر الدنیا و الآخرۃ' سے دوچار ہونا لازم ہے۔ (اللھم اھدنا و اھد الناس جمیعاً)

یہود و نصاریٰ پر انسان کو گمراہ کرنے اور اپنا تسلط قائم کر کے اسے گمراہی سے نکلنے نہ دینے کا ایسا خبط سوار ہوا کہ اس نے معاشرے کے معصوم بچوں کو بھی نہیں بخشا اور نصابی کتابوں میں مقصدِ حیات یعنی اللہ کی عبادت اور اس کی رضا کے حصول کے لیے حتی المقدور کوشش سے غافل کرنے کے لیے ''فرائیڈازم' (Freudism) اور جنسیت کو شامل کیا اور العیاذ باللہ انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ دنیا میں محض جنسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا ہے، لہٰذا اسی پر اپنی توجہ مبذول کرے اور اس طرح انسان کو اشرف المخلوقات کے درجہ سے اتار کر دیگر حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

پھر انسان کو خدا سے کاٹنے کے لیے 'ڈاروِنزم' (Darvinism) کا کیل ٹھونک دیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے اور یہ دنیا 'بقاء اصلح' کے اصول کے تحت وجود میں آئی اور چل رہی ہے۔ العیاذ باللہ! نہ اسے کوئی پیدا کرنے والا ہے اور نہ اسے کوئی چلا رہا ہے اور نہ یہ ختم ہو گی۔

اور یہ دشمنانِ انسانیت اتنا سب کچھ کرنے پر بھی نہیں تھمے اور سیاست کو بھی اپنے دامِ فریب میں لے لیا اور یہ ہوّا کھڑا کیا کہ سیاست اور دین علیحدہ علیحدہ ہیں، لہٰذا انسان کی سیاسی کامیابی محض 'ڈیموکریسی' یعنی جمہوریت میں منحصر ہے اور حکمرانی کے لیے، العیاذ باللہ، خدائی قوانین کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں اور اس طرح شریعت کی جگہ پارلیمانی حلت اور حرمت کا ٹھیکہ دے دیا۔ بس پھر کیا تھا پارلیمنٹ میں موجود ملحد انسانوں کے ٹولے نے شراب نوشی، جوا، ہم جنس پرستی وغیرہ کو حلال قرار دے دیا اور انسان کی بچی کھچی

شرافت کو بھی ملیا میٹ کر دیا۔

اردو زبان میں ضرب المثل مشہور ہے کہ ''دھوبی کا کتا' نہ گھر کا نہ گھاٹ کا'' ایسے ہی مغرب کی اندھی تقلید میں انسان کا بھی یہی حشر ہوا کہ وہ خدا سے کٹا ہی تھا، سرمایہ دارانہ نظام نے اسے انسانی ہمدری سے بھی دور کر دیا اور سود کی بدترین لعنت میں گرفتار کر دیا کہ انسان صرف اپنی مالی ترقی کی فکر کرے اور بس! کوئی دوسرا انسان چاہے کیسی ہی بری حالت میں کیوں نہ ہو، اس کی ہمدردی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں آمدنی کی تقسیم محض چار افراد میں ہوگی: انٹرپرونیور، سرمایہ دار، اجیر اور کرایہ دار۔ معاشرے کے کمزور اور مفلوک الحال لوگوں کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔

ایمان کو سلب کرنے کی عالمگیر سازش

ہم مسلمانوں کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ مغربی تہذیب کے اس ایمان سوز فتنے سے جس نے مسلمانوں کو خاص طور پر اور سارے انسانوں کو عام طور پر اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور انسانیت کو ہلاکت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، کیسے بچا جائے اور اپنے ایمان کو اس سے کیسے بچایا جائے کیونکہ انسان دشمن طاقتیں اپنی قبیح حرکتوں سے اب بھی باز نہیں آئیں اور مذکورہ نظریات کے بعد بھی نئے الحادی نظریات کو ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عام کیا جا رہا ہے مثلاً ''نظریہ 'بگ بینگ' انفجارِ عظیم اور 'اضافت وقت'۔ اسی طرح سال گزشتہ 'اسٹیفن ہوکنگ' کا نظریہ اور سال رواں میں 'ہیگ بوسوں پارٹ اوف گوڈ' کا نظریہ۔ یہ سب مادہ پرستی (میٹرلیزم) کو مہمیز دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس وقت غلبہ انہیں حاصل ہے لہٰذا وہ رکنے والے نہیں۔ سیاسی غلبہ انہیں حاصل ہے، میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے اور ذرائع ابلاغ انسان کی قوتِ فکر پہ کنٹرول کرنے میں فعّال کردار ادا کرتے ہیں۔ اور یہ دونوں ان کے زیرنگیں ہیں۔ 'الیہود والعالم والمؤامرات والاھداف والاسرار' کے مصنف فاروق محمد نجلا نے 'جذور البلاء' ص ۱۴ کے حوالے سے ایک یہودی حاخام (Reichoen) کی یہ بات نقل کی ہے کہ اس نے 'سیمون بن یہودا' کی قبر کے پاس ایک تقریر کی تھی جس میں کہا تھا کہ دنیا پر تسلط کے لے سونا اور چاندی اہم ترین ہتھیار ہیں۔ صحافت اور ذرائع ابلاغ کو دوسری پوزیشن حاصل ہے۔ گویا دولت اور ذرائع ابلاغ دونوں ہی عالمی تسلط کے لیے ناگزیر ہیں، لہٰذا ہمارے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ مال و دولت کے ذریعہ صحافت اور ذرائع ابلاغ پر پورا کنٹرول کر لیں، چاہے اس کے لیے ہمیں کتنی ہی رشوت کیوں نہ دینا پڑے، کیونکہ خاندانی نظام، عقائد اور اخلاق تباہ کرنے کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں'۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہودیوں کی سازش کتنی گہری اور مکمل ہے۔ قرآن نے صحیح کہا ہے

کہ (وان کان مکرھم لتزول منه الجبال) کہ ان کافروں کی مکاری سے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔قرآن کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تدبیریں اور سازشیں اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ راسخ العقیدہ انسان کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے،آمین

یہ دشمنانِ ایمان ہی نہیں دشمنانِ انسانیت بھی ہیں۔محض اپنے مفاد کے خاطر انہوں نے مسلمانوں ہی کو نہیں پورے انسانی معاشرے کو عالمگیر پیمانے پر اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اوران کا مادّیت کا حملہ ایسا خوفناک ہے کہ'الامان والحفیظ'۔انہوں نے زندگی کے کسی بھی اہم شعبہ کو بخشا نہیں بلکہ سب میں مادّی افکار کو پوری مکاری،عیاری اور منصوبہ بندی سے مسلط کر دیا ہے مثلاً عقائد کو مسخ کرنے اور بگاڑنے کے لیے 'ریشنلائزیشن'(Rationalization) کو فروغ دیا جس کا مطلب ہے عقل کو مذہب میں آخری فیصلہ کرنے والا قرار دینا اور ان تمام نظریات کو ردّ کرنا جو عقل سے مطابقت نہ رکھتے ہوں (عالمی یہودی تنظیمیں: ۱۹۳) اور پھر اس عقلیت کے سہارے مذکورہ نظریات کو اس اصول کے پیشِ نظر فروغ دیا کہ 'جھوٹ کو اتنا دہراؤ کہ لوگ اس کو سچ تسلیم کرنے پر آمادہ یا مجبور جائیں'۔اس عقلیت کے نتیجہ میں بالآخر لادینیت نے جنم لیا اور پھر یکے بعد دیگرے مادّی افکار جنم لیتے رہے اور اب بھی لے رہے ہیں۔عقائد کے بعد جمہوریت کے ذریعہ سیاست کو اپنی لپیٹ میں لیا اور آخر میں معاشرت ومعیشت کو'کمرشلائزیشن' کے ذریعہ اپنے قابو میں کر لیا۔ہم سب کو چاہیے کہ دنیا پرستی سے توبہ کریں،آخرت کی فکر کریں اور مغربی فکر وتہذیب کے فتنوں سے بچنے اور اپنا ایمان بچانے کی فکر کریں۔

مغربی تہذیب کے فتنوں سے بچنے کی تدابیر

اپنے ایمان کی حفاظت ہماری اوّلین ترجیح ہونی چاہیے کیونکہ اگر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھانا پڑے گا جس پر موت کے بعد کف افسوس ملنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اس کے بعد عذابِ جہنم سے خلاصی کی بھی کوئی صورت نہ ہوگی جیسا کہ قرآن کریم نے جابجا بیان کیا ہے۔ مغربی تہذیب کے فتنے سے بچنے کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

فتنے کا ادراک

(۱) عربی زبان کی کہاوت ہے 'کیف یتقی من لایدری مایتقی'،یعنی جو شخص فتنوں اوران کے برے انجام سے ناواقف ہو وہ کیسے فتنوں سے بچ سکتا ہے۔لہٰذا راسخین فی العلم علماء ربانیین (اور راست فکر اسلامی سکالرز) کی تحریروں اور تقریروں سے فتنہ کو جانا جائے اور اس کے انجام پر نظر رکھی جائے اور

اس سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۲) دعاء کا اہتمام کیا جائے اور رورو کر اللہ سے مانگا جائے۔

(۳) اسلامی فرائض کا خاص اہتمام کیا جائے مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ہر حالت میں ان فرائض کو ادا کرنے کی انتھک کوشش کی جائے۔

(۴) مقصدِ حیات 'اللہ کی عبادت واطاعت اور اس کی رضامندی کا حصول' ہر حالت میں پیش نظر رکھا جائے اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے جس سے اللہ راضی ہوتا ہو اور ہر اس قول وفعل سے بچا جائے جس سے اللہ ناراض ہوتے ہوں۔

(۵) آخرت کی فکر اپنے اندر پیدا کی جائے اور اس کے لیے صالحین کی صحبت اختیار کی جائے اور ایسی کتابیں پڑھی جائیں اور گھر میں اس کی تعلیم دی جائے جو فکر آخرت پیدا کرتی ہوں۔ ائمہ مساجد اور خطباء کو خاص طور پر امت کے سامنے ایسی آیات کی تفسیر کرنی چاہیے جن میں آخرت اور آخرت کے عذاب، جہنم اور جہنم کے مناظر کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

(۶) اسلام کے بارے میں ادھوری معلومات رکھنے اور غلط نقطۂ نظر والوں سے بچا جائے اور مخلص علماء ربانیین اور راسخین فی العلم سے رابطہ کیا جائے، خاص طور سے ٹیلی ویژن پر جو ٹائی اور شرٹ پہن کر اپنے آپ کو اسلامی اسکالر گردانتے ہیں، جنہوں نے نہ دین کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور نہ دین میں رسوخ رکھتے ہیں، ان سے بچا جائے۔ وہ آپ کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتے بلکہ دین کے نام پر گمراہی کی راہ پر ڈال دیں گے اور آپ کو اس کا احساس بھی نہ ہو سکے گا۔

(۷) دینی تعلیمات کو عام کرنے کا نظام بنایا جائے، یہ بات مسلّم ہے کہ ہماری تمام پریشانیوں کا حل دینی تعلیم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔ ہمارے بچے، بڑے، عورتیں، جوان سب کو خوب اچھی طرح اسلامی عقائد سے واقف ہونا چاہیے، ساتھ ہی روزمرہ کے فرائض کے احکام مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اور تاجر کے لیے تجارت کے احکام، مزدور کے لیے مزدوری کے احکام، غرض جس کا جو پیشہ ہو اس سے متعلق احکام سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسلامی عقائد کو خوب اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا جائے اور روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے شرعی احکام سے واقفیت حاصل کی جائے۔ یا تو صحیح العقیدہ علماء سے براہِ راست سیکھا جائے یا ان کی کتابوں کی گھر میں تعلیم دی جائے، مگر علماء سے براہِ راست سیکھنا زیادہ بہتر ہے۔

(۸) اہل اللہ اور صالحین کی صحبت اختیار کی جائے اور ان کے سامنے اپنے احوال رکھ کر ان کا علاج کرایا جائے، تزکیہ نفس کی فکر کی جائے اور اس سے متعلق کتابیں پڑھی جائیں۔

(۹) اپنے بچوں کی دینی تربیت کی جائے اور انہیں فیشن پرستی سے دور رکھا جائے۔ گھر کا ماحول دینی بنایا جائے۔ کھاتے وقت بسم اللہ، کھانے کے بعد الحمدللہ وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور ادعیہ ماثورہ کا خود بھی عادی بنیں اور گھر والوں کو بھی بنائیں۔ صبح وشام کی مسنون دعائیں اور اذکار کا خاص اہتمام کیا جائے۔

(۱۰) برے لوگوں اور برے کلچر سے مکمل پرہیز کیا جائے، خاص طور پر ٹیلی ویژن، ویڈیو، میوزک اور ناچ گانا سے بچا جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ٹی وی صرف خبروں کے لیے رکھا ہے مگر انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ مرنے کے بعد دنیا بھر کی خبروں کا سوال نہیں ہوگا بلکہ خود آپ کی اپنی خبر لی جائے گی کہ آپ نے کیا اچھائی کی اور کیا برائی اور پھر جزاء وسزا کا فیصلہ ہوگا، تو بس اسی کی فکر میں لگنا چاہیے، اپنی آخرت مقدم باقی سب بعد میں۔

(۱۱) قرآن سے وابستگی ضروری ہے، اس کو پڑھا جائے، سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے، جیسا کہ صحابہؓ نے کیا مگر افسوس کہ امت نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔ نہ اس کی تلاوت ہوتی ہے نہ اس کو سمجھنے کی سعی اور نہ اس پر عمل۔ لہٰذا ائمہ مساجد اور علماء سب سے پہلے اس کو صحت اور تجوید کے ساتھ پڑھنا سیکھیں پھر فکرمندی سے امت کو قرآن کی تعلیم دیں۔ اور جو لوگ قرآن فہمی کے اصول وقواعد سے مکمل واقف ہوں ان سے قرآن کو سمجھا جائے نہ کہ ان لوگوں سے جو نہ عربی جانتے ہوں، نہ حدیث کا علم رکھتے ہوں، نہ اصول وقواعد تفسیر سے واقف ہوں اور نہ نحو وصَرف، علم بیان ومعانی اور علم لغت وغیرہ سے واقفیت رکھتے ہوں بس اردو ترجموں کے سہارے تفسیر کرتے ہوں۔ اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان ہوگا۔ ماضی میں ایسا ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے اور اگر کسی کو تفسیر کے لیے بڑا عالم نہ ملے تو معتبر علماء کی تفاسیر کا مطالعہ کرے، البتہ اگر کوئی بات سمجھنے میں دشواری ہو تو ضرور علماء سے رابطہ کریں۔

(۱۲) وقت کی قدر کریں۔ ہم مسلمان ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے اور اس زندگی کا حساب دینا ہے اور دنیا فانی اور آخرت باقی ہے اور یہ دنیوی زندگی آخرت کی تیاری کے لیے ہے، لہٰذا حتی المقدور اور ہر وقت ایسا عمل کرنا چاہیے جس سے آخرت کا فائدہ ہو اور وقت کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے۔

آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ وقت کا ضیاع ہے، لوگوں کو بے ہودہ باتوں میں مبتلا کر کے اہل

مغرب نے بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ موبائل، ٹی وی، انٹرنیٹ، تفریح گاہوں وغیرہ کو اتنا عام کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ انسان آخرت کی تیاری سے بے خبر ہو کر ان میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے جو آخرت کے لیے خسارے کی بات ہے لہٰذا عقل مندی یہ ہے کہ لغویات سے بچا جائے۔ عادات اور ضروریات کو بھی نیک نیتی کے ذریعہ عبادات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مثلاً کھاتے وقت یہ نیت کر لیں کہ عبادت پر تقویت کے لیے کھا رہا ہوں، تجارت حلال کمائی کی نیت سے ہو تو یہ سب دنیوی امور بھی عبادت بن جائیں گے اور آدمی گناہوں سے بچنے لگے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری فتنوں سے حفاظت فرمائیں۔

(۱۳) سیرت نبوی کا خاص مطالعہ کیا جائے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو تعلیمات وحی کی عملی صورت بتانے کے لیے ہی مبعوث کیا جاتا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین تھے، آپ ﷺ کی سیرت اور زندگی قیامت تک آنے والوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ) 'تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی مین بہترین نمونہ ہے۔'

ان باتوں پر اگر عمل شروع کر دیا جائے تو اللہ کی ذات سے امید قوی ہے کہ وہ اپنی خصوصی رحمت سے مغربی تہذیب کے فتنوں سے بچالے گا اور ایمان پر خاتمہ فرما کر دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہمکنار

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ وطالبات کے لیے 250 روپے سالانہ

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 369-B، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

اتحادِ امت علامہ سید جواد نقوی ☆

منشورِ وحدتِ اسلامی

ضرورت وحدت اسلامی

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْم بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًام بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (البقرہ: ۲۱۳)

'سب لوگ ایک ہی امت تھے (ان میں اختلاف رونما ہوا) تو اللہ نے بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کا فیصلہ کرے اور اختلاف بھی ان لوگوں نے کیا جنہیں کتاب دی گئی تھی حالانکہ ان کے پاس صریح نشانیاں آ چکی تھیں، یہ صرف اس لیے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے پس اللہ نے اپنے اذن سے ایمان لانے والوں کو اس امرِ حق کا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔'

خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی سعادت اور نجات کے لیے انتہائی خوبصورت اور جامع نظام مقرر فرمایا ہے۔ دین، انسانی ہدایت کے لیے اسی الٰہی جامع نظام کا دوسرا نام ہے، خداوند تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا آسمانی کتب نازل کیں۔ حیات بشری کے لیے اصول وضوابط اور حدود کو مقرر کیا، انسانی زندگی کو خطرے میں ڈالنے والے عوامل کی نشاندہی فرمائی اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو مناسب آگاہی اور معرفت عطا فرمائی ہے۔

خدا تعالیٰ نے انسانی سعادت اور نجات کے اصولوں میں سے وحدت کو ایک بنیادی ضابطے کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور اختلاف وتفرقہ کو انسان کی ہلاکت کا سبب قرار دیا ہے۔

☆ مدیر جامعہ العروۃ الوثقیٰ، لاہور

قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (آل عمران: ۱۰۳)

'خدا کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تب خدا نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو اللہ کی اس نعمت کے طفیل تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے جب کہ اس سے پہلے تم تفرقہ واختلاف کی وجہ سے آگ کے دھانے جا پہنچے تھے، خدا نے تمہیں اس سے نجات عطا کی ہے، اس طرح اللہ اپنی آیات کو کھول کر تمہارے

لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ اسی طرح قرآن کریم نے مسلمانوں کو وحدت کی طرف دعوت دیتے ہوئے امت بننے کا حکم دیا ہے۔'

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ۱۰۴)

'تم میں سے ایسی امت ہو جو لوگوں کو خیر کی دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔'

تفرقہ کی مذمت

قرآن کریم میں خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران: ۱۰۵)

'اور تم ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے واضح اور روشن نشانیوں کے بعد آپس میں اختلاف کیا اور گروہوں میں بٹ گئے اور ایسے لوگوں کے لیے عذابِ عظیم ہوگا۔'

تمام آسمانی کتب بالخصوص قرآن کریم نے تمام انسانوں کو بالعموم اور اہل ایمان کو بالخصوص وحدت واتحاد کی دعوت دی ہے انبیاء کرام اور رسل الٰہی علیہم السلام کی کوششیں سب سے زیادہ لوگوں کو خدا پرستی اور وحدت کی طرف دعوت دینے میں انجام پائی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمین کے درمیان وحدت کو واجبات میں سے قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (سورۂ حجرات: ۱۰)

'مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں' لہٰذا تم لوگ اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اخوت مومنین کے اندر برقرار فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

مثل المؤمنین فی توادھم و ترحمھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسھر و الحمی۔

(میزان الحکمت ج ۹، ص ۴۵)

مومنین آپس میں محبت، رحمت اور مہربانی میں ایک پیکر کی طرح ہیں کہ اگر ایک عضو بیمار ہوتو سارا جسم مضطرب ہوجاتا ہے۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے وحدت مسلمین کی خاطر تاریخ میں لازوال قربانیاں دی ہیں، مِن جملہ اپنے حق سے چشم پوشی کرنا، ناگواریوں پر صبر کرنا اور امت کے اتحاد کی خاطر ایک عمر سکوت اختیار کرنا۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی تعلیمات میں مدارات اور رواداری کو مسلمانوں کے درمیان وحدت پرقرار کرنے اور اتحاد کو باقی رکھنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی قرآن سے دوری

لیکن افسوس وصد افسوس کہ آج امت مسلمہ نے خدا، قرآن، رسول ﷺ ائمہ علیہ السلام اور اولیاء دین کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

نبذفریق... كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (البقرہ: ۱۰۱)

'ایک گروہ نے کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا۔'

آج مسلمان اختلاف اور تفرقہ کی آگ میں جل رہے ہیں، محبت والفت کی بجائے دین کے پیروایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں جنہیں قرآن نے بھائی کہا ہے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔قرآن نے فرمایا ہے کہ:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (الانفال ۴۶)

'اللہ اور رسول کی اطاعت کرو آپس میں نزاع مت کرو ورنہ شکست کھاجاؤ گے اور تمہاری آبرو جاتی رہے گی اور استقامت دکھاؤ اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔'

عالم اسلام اور وحدت کا فقدان

ڈیڑھ ارب سے زیادہ جمعیت ہونے کے باوجود مسلمان آج رسوائی اور ذلت کے ساتھ شیطانی اور طاغوتی طاقتوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلمانوں کی زبوں حالی میں سب سے زیادہ حصہ تفرقہ اور آپس کے اختلافات کا ہے۔آج فلسطینی مسلمان ہو یا عراقی، لبنانی ہوں یا افغانی، کشمیری یا دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں، جو کچھ برداشت کر رہے ہیں اور ان پر جو کچھ بیت رہا ہے وہ مسلمانوں کے اندر اختلاف اور تفرقہ کا نتیجہ ہے۔ دشمنان اسلام ہمیشہ سے مسلمانوں کی اس

کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے آئے ہیں اور آج پوری وقاحت کے ساتھ اسلام کے خلاف نئی صلیبی جنگ کا اعلان کر چکے ہیں۔

اسلام کا چار جانب سے محاصرہ ہو چکا ہے۔ ایک طرف سے صلیبی لشکر نے مسلمان ممالک پر چڑھائی اور قبضہ شروع کر دیا ہے، دوسری طرف سے مسلمانوں کے مقدسات کی بے حرمتی زور وشور سے جاری ہے۔ سیکولرازم اور لبرلزم کے نام سے لادینیت کو مسلم معاشروں پر ٹھونسنے کی کوشش ہو رہی ہے اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے اندر موجود اختلافات سے فائدہ اُٹھا کر انہیں ایک دوسرے کے خلاف منحوس جنگ میں جھونکا جا رہا ہے۔

تفرقہ کے نقصانات

اختلافات، فرقہ واریت اور تفرقہ کی وجہ سے عالم اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے جس کا جائزہ لینے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ یہاں پر ان نقصانات کی ایک مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے:

۱۔ مسلمان کا ضعف اور کمزوری
۲۔ ذلت اور سوائی
۳۔ کثرت کے باوجود بے وقعت ہونا
۴۔ پس ماندگی
۵۔ مغربی غلامی
۶۔ منابع ثروت ہوتے ہوئے دوسروں پر انحصار
۷۔ فقر وفاقہ
۸۔ علم وٹیکنالوجی سے محرومی
۹۔ سیاسی ابتری
۱۰۔ معاشی ومعاشرتی بحران
۱۱۔ ثقافتی شکست
۱۲۔ احساس حقارت واحساس کمتری
۱۳۔ غیر اسلامی سیاسی نظام
۱۴۔ کٹھ پتلی حکومتیں
۱۵۔ اسلام کی بدنامی
۱۶۔ مسلمانوں سے عالمی سطح پر نفرت
۱۷۔ غیر مسلموں کی اسلام سے بیزاری
۱۸۔ نئی مسلمان نسلوں کی اسلام کے بارے میں تشویش
۱۹۔ اسلامی سرزمینوں پر دشمنوں کا قبضہ
۲۰۔ اسلامی ثروت کی لوٹ مار
۲۱۔ اسلامی سرزمینوں میں بحران وبے امنی
۲۲۔ اسلامی مقدسات کی بے حرمتی

۲۳۔مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کا قتل ۲۴۔سیکولرازم اور لادینیت کا رواج

۲۵۔فساد و فحشا کی ترویج

وحدت سے مراد

☆ وحدت سے مراد یہ نہیں کہ مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے مذہب سے دست بردار ہو کر کسی دوسرے مذہب کے پیروکار بن جائیں۔

☆ وحدت سے مراد یہ بھی نہیں کہ مسلمانوں کے اندر موجود مشترکات کو ملا کر ایک نیا مذہب وجود میں آئے اور سب اس کے پیروکار بنیں۔

☆ وحدت اسلامی سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ تمام مذاہب کی نفی کر کے بلا مذاہب اسلام کی ترویج کی جائے۔

☆ وحدت اسلامی سے مراد یہ بھی نہیں ہے کے موجودہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب پر اتفاق کیا جائے۔

☆ اور یہ بھی وحدت سے ہرگز مراد نہیں کہ وحدت کی خاطر اپنے اپنے مذہبی اصولوں کو چھوڑ کر دوسروں کے قریب ہوا جائے۔

☆ وحدت اسلامی اس چیز کا نام بھی نہیں ہے کہ کسی ایک شخصیت، گروہ، حزب یا پارٹی کی چھتری کے نیچے سب جمع ہو جائیں۔

☆ وحدت سے مراد یہ نہیں کہ اپنے معتقدات دوسروں پر ٹھونسیں اور انہیں اپنے مذہب کا زبردستی پیرو بنائیں۔

☆ بلکہ وحدت اسلامی سے مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان جس مذہب کے بھی پیروکار ہوں مشترک اصولوں اور باہمی دلچسپی کے مسائل میں آپس میں ایک ہو کر اختلافی مسائل کو اپنے خاص حلقہ کی حد تک محدود رکھیں۔

☆ ایک دوسرے کے مقدسات کی بے حرمتی نہ کریں، مشترکہ دشمن کے خلاف ایک صف بن جائیں، اپنے مقدسات و مشترکات کا دفاع کریں ایک دوسرے کی دل آزادی نہ کریں، آپس میں محبت اور الفت بڑھائیں اور ایک دوسرے کا احترام کریں۔

اسلامی وحدت کے اصلی محور

تمام اسلامی مذاہب وفرقوں اور ان کے پیروکاروں کو آپس میں متحد کرنے والے اصول اور مشترکات، اختلافی موضوعات سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہی مشترکات مسلمانوں کے اندر وحدت کا محور واقع ہو سکتے ہیں۔ بطور نمونہ بعض مشترکات ذکر کیے جاتے ہیں چونکہ تمام مشترکات کے لیے کئی جلد کتابوں کی ضرورت ہے:

۱۔ خداوند تبارک وتعالیٰ پر ایمان　　　　۲۔ وحدانیت خداوند تعالیٰ پر ایمان

۳۔ معاد پر ایمان　　　　۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت وخاتمیت

۵۔ قرآن کریم۔　　　　۶۔ قبلہ واحدہ

۷۔ اہلبیت رسول علیہم السلام　　　　۸۔ اسلام کی مصلحتوں کو دیگر تمام مصلحتوں پر ترجیح دینا

۹۔ قرآن کریم اور سنت نبوی کا تمام مسلمانوں اور مذاہب کے لیے دو بنیادی منابع کے طور پر تمام پہلوؤں میں اعتقاد اور عمل کی بنیاد ہونا۔

۱۰۔ ضروریات دین یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ۔

۱۱۔ دفاع از مقدساتِ دین　　　　۱۲۔ دفاع امتِ مسلمہ

۱۳۔ اسلامی سرزمینوں کا دفاع

۱۴۔ عالمی بحرانوں میں متفقہ موقف جیسے فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق، لبنان وغیرہ۔

وحدت اسلامی کے عملی طریقے

عالم اسلام میں حقیقی معنوں میں اتحاد برقرار رکھنے کے لیے شعار اور زبانی جمع خرچ کافی نہیں بلکہ اس مقصد کے حصول کے لیے بعض اقدامات کی اشد ضرورت ہے، من جملہ:

۱۔ اتحاد مسلمین بخاطر اعلائے کلمۃ اللہ

۲۔ مسلمانوں میں وحدت کے لیے ذہنی اور فکری میدان ہموار کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کے اندر شعور اور بیداری پیدا کرنا

۴۔تمام مذاہب اسلامی میں مشترکات کی ترویج۔

۵۔مختلف مذاہب کے علماء کا آپس میں ملنا اور تبادلہ افکار کرنا۔

۶۔تعیین معیار برائے صدور فتویٰ دینی۔

۷۔علماء اسلام کی طرف سے وحدت تک لزوم اور تفرقہ کی حرمت کے فتاویٰ کا صدور۔

۸۔ضرورت اجتہاد بعنوان اصل اسلامی اور اختلافات اجتہادی کو قبول کرنا اور آراء اجتہادی کا احترام کرنا۔

۹۔سال بھر مختلف مناسبتوں پر وحدت سے متعلقہ پروگرام منعقد کرنا۔

۱۰۔وحدت کے بارے میں مدلل اور علمی لٹریچر شائع کرنا۔

۱۱۔ملکی سطح پر وحدت اسلامی میں مؤثر شخصیات کی مرکزی وحدت کمیٹی بنانا۔

۱۲۔علاقائی سطح پر وحدت کمیٹیاں تشکیل دینا۔

۱۳۔مدارس اسلامیہ و مساجد میں وحدت کے پروگرام منعقد کرنا۔

۱۴۔وحدت کے لیے ویب سائٹ بنانا۔

۱۵۔وحدت کے بارے میں مواد کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا۔

۱۶۔تفرقہ انگیز مواد پر پابندی عائد کرنا۔

۱۷۔تفرقہ انگیز مطالب کا مدلل جواب دینا۔

۱۸۔مسلمانوں کی تحقیر، تکفیر و تفسیق سے اجتناب کرنا۔

۱۹۔تفرقہ انگیز گروہ اور افراد کی شناخت اور نشاندہی کرنا۔

۲۰۔مشترکات اسلامی میں برادرانہ اور اختلافات میں محققانہ روش کی ترویج و ترغیب دلانا۔

۲۱۔اختلافی مسائل میں خصمانہ اور دشمنانہ رویوں کو ترک کرنا اور ان کی مذمت کرنا۔

۲۲۔مشکلات اور مصائب میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

۲۳۔دشمنوں کی تفرقہ انگیز سازشوں سے امت کو آگاہ کرنا۔

۲۴۔عالم اسلام میں واقع ہونے والے حوادث کا تجزیہ و تحلیل کرنا۔

۲۵۔وحدت سے متعلق سوالات کا مدلل جواب دینا۔

۲۶۔مطبوعات کے ذریعے اتحاد اسلامی کو فروغ دینا۔

۲۷۔مختلف زبانوں میں وحدت کے موضوع پر جرائد کا اجراء۔

۲۸۔وحدت اسلامی کے موضوع پر مختلف کانفرنسیں، سیمینارز اور کنونشنز منعقد کرنا۔

۲۹۔تعلیمی نصاب میں وحدت اسلامی کے بارے میں مواد شامل کرنا۔

۳۰۔ عالمی سطح پر داعیان وحدت اسلامی اور اتحاد بین المسلمین کے لیے کوشش کرنے والی شخصیات سے منسوب ایام میں ان کے افکار اور کردار کو احیاء کرنا۔

موانع وحدت

مسلمانوں کے اندر وحدت کی راہ میں کچھ موانع حائل ہیں جنہیں دور کرنا ضروری ہے مثلاً:

۱۔پیروان مذاہب کے درمیان ایک دوسرے کی بابت سوئے تفاہم

۲۔متعصب اور تنگ نظر علماء　　　۳۔درباری اور سرکاری علماء

۴۔حقیقت دین سے ناآشنا اور جاہل افراد　　　۵۔دشمنان دین اسلام کے آلہ کار افراد

۶۔مدارس جن میں تعصب اور تنگ نظری کی تعلیم دی جاتی ہے

۷۔دوسرے مذاہب پر کیچڑ اچھال کر لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے والے خطباء

۸۔پیروان مذاہب کے اندر ایک دوسرے کی نسبت منفی پراپیگنڈا

۹۔استعماری سازشیں اور ان سے لاعلمی　　　۱۰۔فرقہ تکفیریہ جیسے متعصب گروہ

۱۱۔مسلمانوں کے اندر عقلیت کی بجائے جذباتیت کا غلبہ

۱۲۔ایسی حکومتیں جو تفرقہ کے ذریعے اقتدار حاصل کرتی یا اسے طول دیتی ہیں۔

۱۳۔قوم پرستی　　　۱۴۔تحمل اور بردباری کا نہ ہونا

۱۵۔عالم اسلام کے اندر موجودہ بحران سے آگاہ نہ ہونا۔

۱۶۔اختلافات اصولی وفروعی کوہوادینااور بڑھاچڑھاکرپیش کرنا۔

۱۷۔اختلاف اور دشمنی میں فرق کوملحوظ نہ رکھنا۔

۱۸۔ہرگروہ کااپنے آپ کوحق مطلق اوردوسرے کومحض گمراہ سمجھنا۔

۱۹۔علمی منشورِوحدت کانہ ہونا

۲۰۔ثقہ اوردلسوزعلماء کی کمی یافقدان	۲۱۔مسلمانوں کے اندر بالعموم تعلیم وشعور کی کمی

۲۲۔اکثریت کی بے حسی اورموجودہ حالات سے لاتعلقی

۲۳۔قرآن وسنت سے عملی دوری

۲۴۔مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان بے جاتوہمات۔

۲۵۔شخصیت پرستی اورشخصیت محوری	۲۶۔اندھی تقلید

۲۷۔انانیت	۲۸۔مفاد پرستی

۲۹۔فکری جموداورتحجر	۳۰۔ایک دوسرے کے مقدسات کی بے حرمتی

۳۱۔حقیقی وحدت کی بجائے وقتی اورنمائشی وحدت کے مظاہرے

۳۲۔وحدت کی فرصتوں کوضائع کرنا

جن موضوعات کے ذریعے وحدت کامیدان ہموار ہوسکتا ہے

وحدت اسلامی کوعلمی اورعوامی حلقوں میں بحث ومباحثہ کا موضوع بنانے اوراس کے متعلق گفتگو چھیڑنے کے لیےضروری ہے کہ وحدت اسلامی کے بعض پہلواجاگر کیے جائیں تاکہ اہل علم،اہل قلم،اہل سخن نیزاسلام اورامتِ اسلامی کادرد رکھنےوالے حضرات اپنی سوچ کے مطابق اظہارفکرونظرکرسکیں۔وحدت اسلامی کے عملی ہونے کے لیےضروری ہے کہ یہ موضوع عالم اسلام میں ایک زندہ اورروزمرہ کے موضوع میں تبدیل ہوجائے۔اس مقصد کے حصول کے لیےبعض موضوعات بطورنمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔وحدت اسلامی کی ضرورت ہے	۲۔وحدت قرآن کریم کی نظرمیں

۳۔وحدت سنت کی نظرمیں	۴۔وحدت درسیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصحابہ وائمہ اہل بیت

۵۔وحدت ازنظرعقل وعقلاء	۶۔وحدت ازنظرعلماء ومصلحین

۷۔مسلمانوں کے درمیان وحدت کے بنیادی محور ۸۔موانع وحدت اسلامی

۹۔مذاہب اسلامی کے درمیان مشترکات ۱۰۔داعیان وحدت در تاریخ اسلام

۱۱۔مسلمانوں کے اندر وحدت پیدا کرنے میں علماء کا کردار

۱۲۔مذاہب اسلامی کے اندر تفرقہ کے اسباب وعوامل ۱۳۔وحدت از نظر علامہ اقبالؒ

۱۴۔سید جمال الدین افغانی اور وحدت اسلامی ۱۵۔وحدت از نظر مراجع وفقہائے شیعہ

۱۶۔علماء اہل سنت ووحدت اسلامی ۱۷۔تفرقہ پیدا کرنے میں اسلام دشمنوں کا کردار

۱۸۔تفرقہ پیدا کرنے میں حکومتوں کا کردار ۱۹۔حج اور وحدت اسلامی

۲۰۔وحدت اسلامی کے عملی طریقے ۲۱۔امت اسلامی کا صحیح قرآنی تصور

۲۲۔تفرقہ اور انتشار کے نقصانات ۲۳۔ عالم اسلام کی ترقی میں وحدت کی تاثیر

۲۴۔مسلمانوں کی پسماندگی میں تفرقہ کے اثرات ۲۵۔وحدت اسلامی میں علماء کا کردار

۲۶۔مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے والے عوامل

۲۷۔تفرقہ اور وحدت کے پیدا کرنے میں میڈیا کا کردار

۲۸۔وحدت اسلامی کے لیے سرگرم مراکز اور افراد کی شناخت اور تعارف

۲۹۔ تفرقہ ڈالنے والے مراکز اور افراد کی نشاندہی اور تعارف

۳۰۔جذباتیت بھڑکانے والے مسائل کی نشاندہی

۳۱۔عالمی اور علاقائی ضرورتوں کے مطابق منشور وحدت کی تدوین

پروفیسر ملک محمد حسین

ملی مجلس شرعی کے نام

ماہنامہ البرہان کے جولائی ۲۰۱۳ء کے شمارے میں ملی مجلس شرعی کے علماء کا ۱۸ نکاتی متفقہ اعلامیہ بسلسلہ دینی مسالک میں تقارب اور رواداری کا فروغ پڑھنے کو ملا۔ محسوس ہوا کہ جید علماء حق کو فرقہ واریت اور اختلاف مسالک کے نقصانات کا ادراک واحساس ہے۔ ملی مجلس شرعی اپنے پلیٹ فارم پر پہلے بھی اس طرح کے مثبت اقدامات اٹھاتی رہی ہے جو قابل تحسین ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ بازی اور اس پر مبنی فساد، نفرت اور تعصب اب ایک حقیقت ہے۔ یہ صورت حال پیدا بھی علماء کرام نے کی ہے اور

اس کا ازالہ بھی وہی کر سکتے ہیں۔ میں جب بھی قرآن حکیم کا مطالعہ کرتا ہوں اور اس میں دین کے حوالے سے اختلاف، افتراق اور فرقہ بازی کے حوالے سے آیات پڑھتا ہوں اور جو تنبیہات اور وعیدیں اللہ رب العزت کی طرف دی گئی ہیں ان کا فہم حاصل کرتا ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ علماء کرام قرآن حکیم نہیں پڑھتے اور کیا انہیں تفرقہ بازی پر اللہ رب العزت کی ناراضی کا احساس نہیں ہے؟ بہرحال ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم سے ایک مثبت سوچ کا اظہار ہوا ہے تو اسے آگے بڑھانا چاہیے۔صرف البرہان میں ۱۸ متفقہ نکات کا اظہار کافی نہیں ہے۔آئمہ مساجد اور خطباء حضرات میں ان نکات کی وسیع پبلسٹی کی جائے اور ان کے اساتذہ انہیں راغب کریں تا کہ وہ ان نکات پر عمل پیرا ہوں۔اس سلسلہ میں درج ذیل تجاویز دی جاتی ہیں۔

(۱) متفقہ تجاویز کو ایک موثر خط کے ساتھ سینئر علماء کرام اور دینی مدارس کے سربراہان اپنے ملک بھر میں پھیلے ہوئے شاگردوں کو بھیجیں اور عمل کرنے کی ہدایت فرمائیں۔(۲) بڑے بڑے دینی مدارس کے سربراہان اپنے شاگردوں (آئمہ مساجد اور خطباء حضرات) کی ایک روزہ تربیتی نشست رکھیں جس میں فرقہ واریت کی خرابیاں اجاگر کی جائیں۔اور ملی مجلس شرعی کے متفقہ نکات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جائے(۳) اخبارات ورسائل میں ان متفقہ نکات کی وسیع تشہیر کی جائے۔(۴) ملی مجلس شرعی تمام مسالک کے جید علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائے جو پورے سال کے لیے خطبہ ہائے جمعہ کے موضوعات اور ان موضوعات پر خطبہ دینے کے لیے قرآن وحدیث پر مبنی مواد تیار کرے۔خطبہ ہائے جمعہ کا یہ مواد شائع کر کے جمعہ کے خطباء حضرات تک پہنچایا جائے۔(۵) دینی مدارس کے سربراہان اور جید علماء کرام خطبہ ہائے جمعہ پر مبنی اس مواد کو استعمال کرنے کی ترغیب اور تاکید اپنے شاگردوں کو کریں۔(۶) اگر ممکن ہو تو اسلامی نظریاتی کونسل کے ذریعے ان اقدامات پر حکومت کی اشیرباد بھی حاصل کی جائے تا کہ وزارت مذہبی امور ان مفید اور مثبت اقدامات کے لیے فنڈز مہیا کرے۔ویسے اگر یہ کام خلوص دل سے کیا جائے تو ملک کے مخیر حضرات وخواتین مدد ومعاون ہو سکتے ہیں۔ خاکپائے علماء حق پروفیسر ملک محمد حسین